تانبے کے پیسے

تانبے کے تین پیسے

چِین کی کہانیاں

فرخندہ لودھی

۱۹۷۶

فہرست

کچھوے کا بیٹا

کسی جاگیر دار کے باغ میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس تالاب میں ایک کچھوا

رہتا تھا۔ جاگیر دار کی خُوب صُورت بیٹی روز سَیر کرنے کے لیے یہاں آتی تھی۔ ایک دِن کچھوے نے سوچا:

"کیوں نہ میں ایک خُوب صُورت نوجوان بن جاؤں اور اِس لڑکی سے شادی کر لوں۔"

کچھوے نے ایسا ہی کیا۔ اب کسی کو کیا معلُوم کہ دُولہا کچھوا ہے۔ سب لوگ اس شادی پر بُہت خُوش تھے۔ دُلہن کی امّی، ابُّو، رشتے دار اور خُود دُلہن سبھی دُولہا پر جان دیتے تھے کیوں کہ وہ نہایت خُوب صُورت اور نیک دِل تھا۔

لیکن اس میں ایک بات بڑی عجیب تھی، جس سے سب کو اُلجھن ہوتی تھی۔ وہ ہر روز صُبح سویرے، مُنہ اندھیرے، بستر سے نِکل کر کہیں چلا جاتا اور اندھیرا ہونے پر واپس آ جاتا۔ جاگیر دار نے یہ سوچ کر اپنے دِل کو سمجھا لیا کہ مُمکن ہے اُس کے داماد کو بادشاہ کے دربار میں دِن کے وقت کوئی کام سونپا گیا ہو۔ بیوی نے بھی کبھی کُرید کر نہیں پُوچھا، کیوں کہ اس قسم کی باتیں پُوچھنا اچھّی بیویوں کا کام نہیں۔ صِرف لڑکی کی ماں کو شُبہ تھا۔

آخر ماں نے بیٹی سے کہا کہ رات کو سونے سے پہلے اپنے شوہر کی ٹانگ میں لال دھاگا باندھ دینا۔ بیٹی نے اِسی طرح کیا جیسا ماں نے کہا تھا۔

دوسرے روز بیٹی ابھی سو کر نہیں اُٹھی تھی کہ ماں نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بیٹی سے پُوچھا۔ ”تُمہارا شوہر چلا گیا ہے؟“

”جی ہاں، چلا گیا۔“ بیٹی نے جواب دیا، اور پھر اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہاں لال رنگ کا دھاگا لٹکا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ماں نے کہا:

”اب ہم پتا لگا سکتے ہیں کہ وہ دِن کے وقت کہاں جاتا ہے۔ آؤ، باہر چلیں۔ دیکھیں دھاگا کہاں جاتا ہے۔“ ماں بیٹی کو کھینچتی ہوئی باغ میں لے گئی۔ لال دھاگا دروازے کی طرف جانے کے بجائے تالاب کی طرف جاتا تھا۔ اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ لال دھاگا ہولے ہولے پانی کی سطح پر ہِل رہا تھا۔

”بیٹی، تُمہارے ابّا کو بتانا ضروری ہے۔ وہ بھی آ کر دیکھ لیں۔“ ماں نے کہا اور فوراً نوکر دوڑایا کہ مالِک کو بُلا لائے۔

جاگیر دار نے آکر تمام حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو دِل تھام کر رہ گیا۔

اُسے اپنے داماد پر بہت فخر تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ کچھوا نکلا۔ اُس نے سوچا، ہو نہ ہو یہ وُہی چھلّاوا کچھوا ہے جِسے میرے باپ نے تالاب میں ڈالا تھا۔

اس نے زور زور سے نوکروں کو آوازیں دیں۔ سب جمع ہو گئے تو حکم دیا کہ تالاب کو ابھی خالی کر دو۔ جب تالاب خالی ہو گیا تو اُنہوں نے دیکھا کہ اُس کی تہہ میں کچھوا لیٹا ہے اور اُس کی ایک ٹانگ میں لال دھاگا بندھا ہے۔ یہ دیکھ کر جاگیر دار غصّے سے پاگل ہو گیا اور اُسی وقت کچھوے کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ پھر نوکروں کو حکم دیا کہ کچھوے کی لاش اُٹھا کر پھینک دو۔ یہ کہہ کر وہ پیر پٹختا گھر میں چلا گیا۔

کُچھ دِن بعد جاگیر دار کی بیٹی کو خُدا نے ایک پیارا سا بیٹا دیا، جس کو پا کر وہ سارے دُکھ بھُول گئی۔ یہ بچّہ اِتنا پیارا تھا کہ کوئی حد نہیں۔ ماں اُس کو بڑی محبّت سے پالنے لگی۔ لڑکا ذرا سیانا ہوا تو وُہ بھی ماں کا خیال رکھنے لگا۔

جاگیر دار کی بیٹی اب بھی باغ کی سیر کو جایا کرتی تھی تاکہ اُس کا دل بہلا رہے۔

ایک دِن سیر کرتے کرتے ایک جگہ سے اپنے شوہر کچھوے کی ہڈّیاں پڑی نظر آئیں۔ اُس نے دل میں کہا :

" کچھوا تھا تو کیا ہوا، تھا تو میرا شوہر۔ مُجھے چاہیے کہ اُس کی ہڈّیاں سنبھال کر رکھ لوں، جیسا کہ ہمارا رواج ہے۔"

اُس نے ہڈّیاں جمع کیں اور ریشمی تھیلے میں بھر کر اپنے پلنگ کے پائے میں لٹکا دیں۔ اُس نے خُود کو سمجھایا، ایک دن آئے گا جب وُہ پیارے شوہر کی ہڈّیاں با عزّت طریقے سے دفن کر دے گی۔

دُوسری طرف بیٹا روز بروز سیانا اور سمجھ دار ہوتا جا رہا تھا۔ مگر اُس کی لکھائی پڑھائی کی طرف کِسی نے توجّہ نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ آٹھ برس کا ہو گیا۔ وہ سارا سارا دِن گلیوں میں کھیلتا رہتا اور لڑکوں کے ساتھ مل کر سیر تماشے کرتا۔

کُچھ عرصے بعد بُوڑھا جاگیر دار مر گیا۔ اُس کی موت کے بعد بوڑھی ماں بھی زیادہ دِن تک زندہ نہ رہی۔ لڑکی جائداد بیچ بیچ کر گزارہ کرتی رہی اور جب ساری جائداد بھی ختم ہو گئی تو اپنا اور بیٹے کا پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری کرنے

لگی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ اُس کے بیٹے کا کیا ہو گا؟ وہ نہ تو پڑھتا لکھتا تھا، نہ کوئی ہُنر سیکھتا تھا۔ اُسے تو بس شرارتیں کرنی آتی تھیں۔

سب سے بڑی فکر تو اُسے یہ تھی کہ چار پیسے پاس ہوں تو شوہر کی ہڈّیوں کو عزّت کے ساتھ دفن کیا جائے۔ کچھوے کی ہڈّیاں ریشم کے تھیلے میں بندھی رکھی تھیں۔ پُرانے زمانے کے چین میں لوگوں کا خیال تھا کہ مرنے والے کو جِتنے اچھّے طریقے سے دفن کیا جائے گا اُس کی اولاد کو اتنی ہی دولت اور صحت نصیب ہو گی۔ ماں کو شک کیا، پُورا یقین تھا کہ اُس کا بیٹا اس لیے لکھتا پڑھتا نہیں کیوں کہ اُس کے باپ کی روح بھٹکتی پھِر رہی ہے۔

چینی لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ مرنے والے کو کِسی اچھّی جگہ دفن کیا جائے تُو اُس کی روح کو سکون مل جاتا ہے۔ سو ماں کو دِن رات یہی دُکھ کھائے جا رہا تھا۔

ایک روز ایک قبر کھودنے والا کِسی امیر آدمی کے بزرگوں کی ہڈّیاں دفن کرنے کے لیے کوئی اچھی سی جگہ تلاش کر رہا تھا۔ آخر اُسے وُہ جگہ مِل گئی۔

شہر کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی ندی جھاگ اُڑاتی، شور مچاتی گُزرتی تھی۔ پانی کی

لہریں اتنی تیز اور بُلند تھیں کہ اللہ توبہ! ندی کا پاٹ چوڑا تھا اور پانی بہت گہرا۔ تیز لہریں کِنارے توڑ دیتی تھیں۔ کنارے ٹوٹنے اور گِرتے رہنے سے ندی کے بیچ میں ایک جزیرہ سا بن گیا تھا، جِس کی شکل بُہت بڑے اژدہے کی سی تھی۔ امیر آدمی کے بزرگوں کی روحوں کو خوش کرنے کے لیے اُس جزیرے سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی۔

پر جگہ دیکھنے کے بعد وہ آدمی بھاگا بھاگا امیر آدمی کے پاس پُہنچا اور بتایا کہ اُس نے وُہ جگہ تلاش کر لی ہے جِس کی حضور کو مدّت سے تلاش تھی۔ پھر اُس نے اژدہا نما جزیرے کی پوری تفصیل بیان کی۔ امیر آدمی بُہت خُوش ہوا اور حکم دیا کہ سالہا سال سے سنبھال کر رکھی ہوئی بزُرگوں کی ہڈّیاں اب دفن یو جانی چاہئیں۔

لیکن مشکل یہ پڑی کہ جزیرہ ندی کے عَین بیچ میں تھا۔ وہاں تک کون پہنچے؟ ندی کی غُصیلی لہروں پر کوئی کشتی بھی نہیں چل سکتی تھی۔ قبر کھُودنے والا اور امیر آدمی دونوں بیٹھے سوچا کیے، لیکن کُچھ نہ سُوجھا۔ آخر قبر کھودنے والے نے کہا "جناب، میرا خیال ہے کہ ایک اِشتہار چھاپا جائے، جس میں لکھا جائے کہ جو

شخص ندی میں سے گُزر کر اس جزیرے میں آپ کے بزرگوں کی ہڈّیاں دفن کرے گا۔ اُس کو بُہت بڑا اِنعام دیا جائے گا۔ روپے کے لالچ میں کوئی نہ کوئی شخص آمادہ ہو جائے گا۔"

کامیابی کی اُمّید کم تھی، پھر بھی امیر آدمی کو یہ تجویز پسند آئی۔

اُس نے ایک اشتہار چھاپا جِس میں جزیرے میں ہڈّیاں لے جا کر دفن کرنے والے کو ایک ہزار چاندی اور ایک ہزار سونے کی اشرفیاں انعام دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔

یہ اِشتہار شہر میں جگہ جگہ لگا دیا گیا۔ لوگوں نے اِس اشتہار کر دیکھا تو وہ ہنستے اور مذاق اُڑانے لگے۔

"سونے چاندی کے سکّے کِس کام کے، جب آدمی پانی میں ڈوب کر اُبھرے گا ہی نہیں۔۔۔ واہ!"

کچھوے کا بیٹا پاس ہی کھیل رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو ہنستے اور مذاق اُڑاتے سُنا تو

ایک چھابڑی والے سے پُوچھا :

"اس اشتہار میں کیا لکھا ہے ؟"

"یہ تُمہارے کام کی چیز نہیں ہے ،بیٹے۔" چھابڑی والے نے جواب دیا۔

جب لڑکے نے اِصرار کیا تو چھابڑی والے نے اشتہار پڑھ کر سُنایا۔ لڑکا چیخ کر بولا :

"یہ سونے چاندی کے سکّے میں حاصل کروں گا۔"

یہ سُن کر جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے ، زور زور سے ہنسنے لگے۔ لیکن لڑکے نے اس کی پروانہ کی۔ وُہ چیخ کر بولا :

"میں اِس دریا میں اُتر سکتا ہوں۔ اِس ندی میں تیر سکتا ہوں۔" ایک آدمی نے حیران ہو کر پُوچھا:

"تم تیرو گے ؟ آٹھ برس کے چھوکرے ؟"

لڑکے نے کہا۔ "میں ندی میں تیر سکتا ہوں، تُم مُجھے اس امیر آدمی کے پاس لے

چلو۔" وُہ آدمی اُسے امیر آدمی کے پاس لے گیا۔

امیر آدمی اس چھوٹے سے لڑکے کو دیکھ کر بُہت حیران ہُوا۔ کسی بڑی عُمر کے آدمی نے یہ پیش کش قبول نہیں کی تھی، اس لیے اُس نے لڑکے ہی کو غنیمت جانا اور اس سے پُوچھا:

"کیا تم واقعی ندی میں تیر سکتے ہو؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں۔ لیکن پہلے میں اپنی ماں کو بتا آؤں۔"

یہ کہہ کر لڑکا بھاگا بھاگا ماں کے پاس گیا۔ ماں نے یہ خبر سُن کر پہلے اُس کو جانے سے روکا۔ پھر سوچا، آخر یہ کچھوے کا بیٹا ہے۔ تیرنا جانتا ہو گا۔

پھر اچانک اُسے اپنے شوہر کی ہڈّیوں کا خیال آیا۔ اُن کو دریا میں دفن کرنے کے لیے جزیرے سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جلدی سے اندر گئی اور تھیلے میں پڑی ہڈّیاں اُٹھا لائی۔

"بیٹا، اِنہیں بھی لیتے جاؤ۔ اور جب تُم جزیرے میں پُہنچ جاؤ تو انہیں وہاں دفن کر

دینا۔"

"بہُت اچھّا، امّی۔"

لڑکے نے تھیلا لیا، دوبارہ امیر آدمی کے پاس پہنچا اور پھر امیر آدمی کے بزُرگوں کی ہڈّیوں والی صندوق اور اپنے باپ کی ہڈّیوں والا تھیلا پکڑے ندی کی طُوفانی لہروں میں کُود گیا۔

پانی میں اُسے کوئی مُشکل پیش نہ آئی۔ کچھوے کی طرح غوطے لگاتا وہ اس اژدھا نُما جزیرے میں پُہنچ گیا۔ وہاں اُس نے ہڈّیاں دفن کیں اور جیسے گیا تھا ویسے ہی واپس آ گیا۔

امیر آدمی بہت خوش ہوا۔ اُس نے دو ہزار سونے چاندی کی اشرفیاں گِن کر لڑکے کے حوالے کیں اور اپنے دو ملازموں کو حکم دیا کہ وہ لڑکے کو اُس کے گھر چھوڑ آئیں۔

لڑکے کی ماں نے جب یہ دیکھا کہ اُس کا بیٹا کامیاب واپس لوٹا ہے اور مال و دولت

بھی ساتھ لایا ہے تو وہ خُوشی سے پھُولی نہ سمائی۔ یہی کچھوے کا بیٹا، بزُرگوں کی دُعاؤں اور اپنی محنت سے ایک دن چین کا بادشاہ بن گیا۔

ظالِم دیو

کسی شہر میں ایک بیوہ عورت رہتی تھی۔ ایک دِن وہ اپنے پیارے ماں باپ کے لیے میٹھی روٹیاں لے کر چلی۔ ماں باپ کا گھر شہر سے کافی دُور تھا۔ وہ جس قدر تیز چل سکتی تھی، چل رہی تھی۔ یہ وُہ زمانہ تھا جب چینی عورتوں کے پاؤں چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے۔ بچپن ہی سے اُن کے پاؤں میں لوہے کے جوتے پہنا دیے جاتے تھے تاکہ پاؤں بڑے نہ ہوں۔

کچّے راستے پر اُس عورت کے سوا کوئی نہ تھا۔ راستے کے دونوں طرف، دُور دُور تک چاول کے کھیت پھیلے ہُوئے تھے۔ جُوں ہی یہ عورت بانسوں کے گھنے جھُنڈ کے قریب سے گُزری، اس میں سے ایک دیو کُود کر باہر آگیا۔

”ہاؤ! ہاؤ!“

دیو کا جسم بیل کا سا تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ اِتنا بڑا تھا جیسے پانی کا مٹکا۔ لمبے لمبے دانت باہر کو نِکلے ہوئے اور پنجے اندر کو مُڑے ہوئے تھے۔ یہ دیو آدم خور تھا، اور انسان کا گوشت مزے لے لے کر کھاتا تھا۔

دیوؤں کے پاؤں بڑے بھدّے اور موٹے موٹے ہوتے ہیں۔ جب وہ زمین پر چلتے ہیں تو پاؤں سے بھد بھد کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

بے چاری بیوہ نے دیو کو دیکھا تو ڈر کے مارے گھٹنوں میں مُنہ دے لِیا تاکہ اس خوف ناک چیز سے بچ سکے۔

دیو نے اپنی لال انگارہ سی آنکھیں گھُمائیں اور گرج کر کہا۔ ”مُجھے میٹھی روٹیاں دے دو۔ مُجھے یہ میٹھی روٹیاں دے دو۔“

عورت نے روتے ہُوئے کہا ”میں یہ روٹیاں نہیں دوں گی۔ یہ میرے ماں باپ کے لیے ہیں۔“

دیو غرّایا اور بولا۔ ''اچھّا ٹھیک ہے۔ نہ دو۔ میں آج رات تُمہارے گھر آؤں گا۔ دانتوں سے تُمہاری کھال اُدھیڑوں گا اور پنجوں سے تُمہارے ٹکڑے کر دوں گا۔''

یہ سُن کر عورت نے چیخ ماری اور مٹّی کے ایک ڈھیر میں گھُس گئی۔ بہُت دیر بعد اُس نے ڈرتے ڈرتے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیو جا چُکا تھا۔

عورت کو معلُوم تھا کہ دیو جو کہتے ہیں، وہ کرتے ضرُور ہیں۔ آج کی رات اُس کے بے موت مرنے کی رات تھی۔ رات کو وہ ظالِم اُس کے گھر آئے گا اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا جائے گا۔ یہ سوچ کر عورت روٹیوں کو بھُول بھال گئی اور غم کے مارے سر پکڑ کر رونے لگی۔

راہ چلتے مُسافِر رحم کھا کر رُک گئے اور پُوچھنے لگے کہ تُم پر کیا بِپتا پڑی ہے؟

''آج رات دیو مُجھے کھا جائے گا۔'' عورت نے روتے ہوئے جواب دیا۔

ان لوگوں نے عورت کی بِپتا سُن کر فکر مندی سے سر ہلایا اور کہا۔ ''بی بی، یہ تو ہونا

ہی ہے۔"

جب لوگ اِس طرح کھڑے اپنی اپنی ہانک رہے تھے تو اُدھر سے ایک پھیری والا گُزرا۔ اُس نے لوگوں کو یوں جمع دیکھ کر پُوچھا:

"بھئی، مُعاملہ کیا ہے؟ یہ عورت کیوں رو رہی ہے؟"

لوگوں نے بتایا تو پھیری والا اپنے کندھے سے بہنگی اُتار کر عورت سے بولا:

"دیکھ بہن، میں تُجھے بیس کِیلیں دیتا ہوں۔ تُو یہ کِیلیں گھر کے دروازے کی دہلیز میں گاڑ دینا۔ دیو جوں ہی گھر میں داخل ہو گا، یہ کِیلیں اُس کے پیروں میں چُبھ جائیں گی اور وُہ بھاگ جائے گا۔"

پھیری والے نے اِتنا کہا۔ عورت کو کِیلیں دیں اور بہنگی کندھے پر رکھ اپنے رستے ہو لیا۔

لیکن بیوہ بے چاری کی تسلّی نہ ہوئی۔ وُہ پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ اُس کی چیخیں سُن کر ایک کسان، جو اپنے کھیت میں ڈالنے کے لیے گوبر اکٹھّا کر رہا تھا،

بھاگا بھاگا آیا اور پُوچھنے لگا کہ اِس عورت کو کیا تکلیف ہے جو یوں چلّا رہی ہے؟ عورت نے اپنا قصّہ اُسے بھی سُنایا۔ کسان سر جھکائے کُچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا:

"لو۔ یہ تھوڑا سا گوبر لے لو۔ اِسے اپنے گھر کے دروازے کے سامنے پھیلا دینا۔ دیو گھِن کھا کر واپس چلا جائے گا۔"

عورت نے گوبر لے لیا۔ لیکن وہ پہلے سے بھی زیادہ زور زور سے رونے لگی۔ اُسے کِسی طرح صبر نہیں آ رہا تھا۔ اُسی وقت ایک سپیرا اُدھر آیا۔ اُس نے عورت کو بَین کرتے سُنا تو رُک گیا۔ اُس کے پوچھنے پر عورت نے دیو کا قصّہ الف سے ے تک دُہرا دیا۔ سپیرے کو عورت پر رحم آ گیا۔ اُس نے کہا۔

"لے بہن، یہ دو سانپ بُہت ہی زہریلے ہیں۔ ان کو پانی کے مٹکے میں ڈال کر رکھ دینا۔ دیو تُجھے کھانے سے پہلے ہاتھ ضرُور دھوئے گا۔ جُوں ہی وہ پانی لینے کے لیے مٹکے میں ہاتھ ڈالے گا، یہ سانپ اُسے ڈس لیں گے۔"

عورت نے سانپ لے کر سپیرے کا شکریہ ادا کیا، لیکن جب وہ نظروں سے اُوجھل ہو گیا تو پھر رونے پیٹنے لگی۔

اب اُدھر سے ایک مچھیرا گزرا۔ اُس نے لوگوں سے پوچھا۔ ”بھئی، یہ کیا رونا دھونا ہو رہا ہے؟ خیریت تو ہے؟“ عورت برابر چلّائے جا رہی تھی۔ لوگوں نے ساری کہانی اُسے بھی سنائی۔ نیک دل مچھیرے نے دو مچھلیاں ہنڈیا میں ڈال کر عورت کو دیں اور کہا:

”لو بی بی، یہ دو مچھلیاں ہیں۔ اِن کو پکانا مت ورنہ یہ اتنی سخت ہو جائیں گی کہ دانتوں سے کاٹی نہ جا سکیں گی۔ اِن کو اس ہنڈیا میں پڑا رہنے دنیا۔ دیو کو جب سانپ ڈسیں گے تو وہ سوچے گا کہ ہنڈیا میں گرم پانی ہے۔ چلو، اس سے اپنے زخم دھو لیتا ہوں۔ جوں ہی وہ ہنڈیا میں ہاتھ ڈالے گا، یہ مچھلیاں اُس کو کاٹ لیں گی، اور اُسے اِتنی تکلیف ہو گی کہ وہ فوراً ہی بھاگ کھڑا ہو گا۔“

عورت کو مچھیرے کی بات کا یقین تو نہ آیا، پھر بھی اُس نے مچھلیاں لے کر اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر رونے دھونے بیٹھ گئی۔

اب اُدھر سے ایک انڈے والا گُزرا۔ ”انڈے لے لو، انڈے۔ گرم گرم انڈے۔“

عورت کو آہ و زاری کرتے دیکھ کر انڈے والا بھی رُک گیا اور پُوچھنے لگا کہ اس عورت کو کیا ہوا؟ یہ کیوں رو رہی ہے؟ جب اُس کو تمام قصّہ بتایا گیا تو وہ سر کھُجاتے ہوئے سوچنے لگا۔ اُسے یہ معاملہ بہت اُلجھا ہوا معلُوم ہوا۔ سوچ سوچ کر تھک گیا تو بولا :

"اچھا، یہ لو کُچھ انڈے۔ اِن کو چولھے کی راکھ میں دبا دینا۔ دیو کو سانپ اور مچھلیوں نے کاٹا تو ظاہر ہے اُس کی انگلیوں سے خُون نِکلے گا۔ بہتے خُون کو بند کرنے کے لیے وُہ راکھ میں ہاتھ ڈالے گا۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو انڈے پھٹ جائیں گے اور اُن کے چھلکے اُس کی آنکھوں میں پڑ جائیں گے۔"

عورت نے انڈے اپنی جھولی میں ڈالے اور لگی پھر چلّا چلّا کر آسمان سر پر اُٹھانے۔ اُس کی چیخ پُکار سُن کر ایک چکّیاں بیچنے والا چلتے چلتے رُک گیا اور پُوچھ گُچھ کرنے کے بعد بولا:

"میں تُمھیں چکّی کا پاٹ دیتا ہوں۔ اُس کا وزن بیس سیر ہے۔ اِسے اپنے بستر کے اُوپر چھت کے شہتیر میں لٹکا دینا۔ جب دیو تُم پر حملہ کرے تو پاٹ کی رسّی کاٹ

دینا۔ پاٹ اُس کا سر کُچل دے گا۔

"لیکن اُسے جان سے مارنا ضُروری ہے۔ سولو، یہ ہے لوہے کا لٹھ۔ جب وہ گرنے لگے تو یہ لٹھ

مار مار کر اُس کا کچومر نکال دینا۔"

اب شام ہو چُکی تھی۔ عورت نے میکے جانے کا اِرادہ ترک کر دیا۔ میٹھی روٹیاں خود کھالیں۔ پھر لوگوں سے مِلی تو ساری چیزیں ایک مزدُور کے سر پر رکھوا کر اپنے گھر چلی گئی۔

گھر پُہنچ کر اُس نے ہر چیز کو اپنی اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ جُوں جُوں رات ہو رہی تھی، اُسے اپنی موت قریب نظر آ رہی تھی۔

جب خُوب اندھیرا ہو گیا تو وہ بستر پر لیٹ گئی۔ مگر نیند کہاں! وُہ چُپکے چُپکے رو رہی تھی اور کان آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

آدھی رات گُزر گئی۔ چوکیدار لاٹھی ٹھک ٹھک کرتا گلی کا چکر لگا رہا تھا۔ جاگتے

رہو! جاگتے رہو! میں آ گیا، چور لٹیرو میں آ گیا۔" یہ کہتا ہُوا وہ گلی کے دُوسرے نکّڑ کی طرف چلا گیا۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔

پھر اچانک، بالکل اچانک، بھد بھد کی آواز آئی۔ یہ دیو ہی کے بھدّے پاؤں کی آواز تھی۔ وُہ آ گیا تھا۔

"ہاؤ!۔۔۔ہاؤ!۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو!" وُہ غرّا رہا تھا۔

عورت بے چاری نے ڈر کے مارے سانس روک لی۔ دیو نے ایک خوف ناک دھماکے سے دروازہ توڑ دیا۔ جب اُس کے پاؤں میں کِیلیں چُبھیں اور ہاتھ گوبر سے بھر گئے تو وُہ غصّے سے گرجا:

"یہ کیا ہے؟ یہاں کانٹے اور گندگی پھیلا رکھی ہے۔ لیکن اب تو میں اندر آ گیا ہوں۔ اس عورت کو ختم کر کے ہی دم لوں گا۔ لیکن پہلے اپنے گندے ہاتھ دھو لوں۔"

”ہائے! دیو نے جُوں ہی پانی لینے کے لیے مٹکے میں ہاتھ ڈالا، سانپوں نے پھن لہرا کر اُسے ڈس لیا۔

”کیسی بُری جگہ ہے! آہ! یہاں تو بڑی خوف ناک چیزیں ہیں۔ میرا خیال ہے، ہنڈیا میں گرم پانی ہو گا۔ اس میں ہاتھ ڈالوں گا تو ہاتھ کا درد کم ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر اُس نے ہنڈیا میں ہاتھ ڈالا تو مچھلیوں نے کاٹ لیا۔

”ہائے! خون بہہ بہہ کر تو میرا ناس ہو جائے گا۔ زخموں پر تھوڑی سی راکھ چھڑکتا ہوُں، تا کہ خُون بہنا بند ہو جائے۔“

جیسے ہی اُس نے چولھے میں ہاتھ ڈالا، انڈے پھٹ گئے اور اُن کے چھلکے دیو کی آنکھوں میں گھُس گئے۔ وہ زور سے دھاڑا:

”اُف میری آنکھیں! مُجھے کُچھ دِکھائی نہیں دیتا۔ پھر بھی چُڑیل، میں تُجھے نہیں چھوڑوں گا۔ تو ہے کِدھر؟ “

وُہ بھد بھد چلتا ہوا عورت کے بستر کے پاس پُہنچ گیا۔ اُسی وقت عورت نے چکّی

کے پاٹ کی رسّی کاٹ دی۔ چکّی کا پاٹ دھڑام سے دیو کے سر پر پڑا۔ وہ چکرا کر فرش پر ِگر گیا۔ عورت نے لٹھ مار مار کر اُسے مار ڈالا۔

دیو نے بیوہ کی چیزیں توڑ پھوڑ کر کافی نقصان کیا تھا۔ لیکن عورت کو دیو کی ہڈّیاں اور کھال بیچ کر اِتنے روپے مل گئے کہ اُس نے ساری چیزیں نئ خرید لیں۔ پھر بھی کافی پیسے بچ گئے۔

تانبے کے تین پیسے

کسی جگہ ایک پھیری والا رہتا تھا۔ وہ تمام دن اپنے کندھے پر بہنگی رکھے شہر کی گلیوں میں پھرتا۔ بہنگی کے دونوں سروں پر بڑے بڑے پلڑوں میں تمباکو بھرا ہوتا تھا۔

یہ بُہت مُشکل کام تھا۔ وہ دِن بھر کبھی اس بازار میں آواز لگاتا اور کبھی دوسرے بازار میں۔ کبھی وُہ آواز لگاتا اور شہر کے مغربی دروازے تک جا پہنچتا۔

مغربی دروازہ اصل میں صدر دروازہ تھا۔ یہاں سے ہر قسم کے لوگ گُزرتے تھے۔ اس لیے یہاں بہت بھیڑ ہوتی تھی۔ پسینے میں شرابور دیہاتی پھل، دودھ،

ترکاریاں، اناج، ایندھن، کوئلا بیچنے کے لیے اسی مغربی دروازے سے شہر میں داخل ہوتے تھے۔ تمباکو فروش، جس کا نام چانگ تھا، اس بھیڑ میں گھُستا، آگے بڑھتا اور اپنا مال بیچنے کے لیے زور زور سے چیختا۔ ایک صُبح وہ لوگوں کی بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک بُوڑھا پھٹے حالوں، بدن پر چیتھڑے لٹکائے، اس کے پاس آکر رُکا اور اُس کے کندھے کو چھُوتے ہوئے بولا:

"نوجوان، کیا تُم میرے ہاتھ تھوڑا سا تمباکو بیچو گئے؟"

یہ کہہ کر بُوڑھے نے اپنے پھٹے ہوئے چُغے کے نیچے سے ایک پائپ نِکالا۔

چانگ رُک گیا اور اپنی بہنگی رکھنے کے لیے کھُلی جگہ دیکھنے لگا۔ لیکن اُسے جگہ نہ ملی، کیوں کہ بھیڑ بہُت تھی۔ بُوڑھے نے اسے تانبے کے تین پیسے دِکھائے تو وہ بڑا خُوش ہوا۔ چُٹکی بھر تمباکو کے تین پیسے بُرے نہیں۔ اُس نے اپنے گاہک کو اِشارہ کیا کہ وہ خُود ہی اپنا پائپ بھر لے۔

بڑے میاں نے تمباکو کی چُٹکی بھری اور پائپ میں رکھ لی۔ پھر دوسری چُٹکی بھری، اُسے انگوٹھے اور اُنگلی کے درمیان رکھ کر دبایا، اور پھر پائپ میں رکھ لی۔

چانگ کا خیال تھا کہ پائپ میں دوسری چُٹکی کی گُنجائش نہیں ہو گی۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ اس کا گاہک تیسری چُٹکی بھی پائپ میں ٹھونس رہا ہے تو وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔ پھر یُوں ہُوا کہ بڑے میاں پائپ میں تمبا کُو ڈالتے گئے لیکن پائپ نے بھرنے کا نام نہ لیا۔ چانگ اُسی طرح بوجھ اُٹھائے، حیرت سے مُنہ کھولے، چُپ چاپ یہ تماشا دیکھتا رہا۔

بڑے میاں نے اُس وقت تک ہاتھ نہیں روکا جب تک چانگ کا سارا تمبا کُو اُس کے پائپ میں گُم نہیں ہو گیا۔ پھر اُس نے تین پیسے چانگ کی ہتھیلی پر رکھ دیے، پائپ سُلگایا اور بڑے اِطمینان سے مُسکراتا ہوا بھیڑ میں گُم ہو گیا۔

سٹپٹائے ہوئے چانگ نے تینوں پیسے گلّے میں ڈال دیے اور گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ اُسے سخت غصّہ آ رہا تھا۔

"ناکامیاں بوجھ بڑھا دیتی ہیں۔" چانگ نے اپنے آپ کو سمجھایا کیوں کہ جُوں جُوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، اُس کی بہنگی بھاری ہوتی جا رہی تھی۔ آخر میں تو اتنی وزنی ہو گئی کہ اُٹھانا مُشکل ہو گیا اور چانگ کو راستے میں کئی جگہ بہنگی نیچے رکھ کر سانس

لینی پڑی۔

ایک جگہ اس نے غور سے گلّے کو دیکھا۔ واہ! گلّا تانبے کے پیسوں سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ اُس نے خُوشی سے اُچھل کر گلّا اُٹھایا اور کسی نہ کسی طرح گھر پُہنچ ہی گیا۔ جوش اور خُوشی کے مارے اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پا کر تمام پیسے تجوری میں رکھ دیے۔

اس کام سے فارغ ہو کر اُس نے اپنا پائپ سُلگایا اور صحن میں آ کر اِطمینان کے ساتھ صُبح کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ ابھی اُس نے مُشکل سے تین دم لگائے ہوں گے کہ کہ کمرے میں سے چھَن چھَن کی آوازیں آنے لگیں۔ وُہ گھبرایا ہُوا کمرے کی طرف بھاگا۔ کیا دیکھتا ہے کہ تجوری پیسوں سے بھری ہوئی ہے، ڈھکنا ہٹ گیا ہے اور پیسے تجوری میں سے نِکل کر زمین پر گِر رہے ہیں۔

چانگ نے ناک کھُجائی اور دوڑ کر بوری لے آیا۔ اُس نے تجوری کے پیسے بوری میں ڈال دیے۔ لیکن تجوری پھر پیسوں سے بھر گئی۔ ایک ایک کر کے تین بوریاں بھر چُکا، تب کہیں جا کر پیسوں کی بارش بند ہوئی۔

چانگ بہت خوش تھا۔ اُس کے پاس ڈھیروں پیسے تھے۔ اُس نے سوچا، اب بازار

میں پھیری لگانے سے بہتر ہے کوئی اچھّا سا کاروبار کیا جائے۔ بس وُہ کُچھ روپیہ لگا کر کباڑیے کی دُکان کھول لے گا۔ کتنا مزا آئے گا۔ وہ اپنی دُکان میں شان سے بیٹھے گا۔

اُس نے ایسا ہی کیا۔ تینوں بوریوں کے پیسوں سے اُس نے دُکان کھول لی۔ کاروبار چل نکلا۔ سب سے اچھّی بات یہ تھی کہ تجوری ہمیشہ بھری رہتی تھی۔ وہ اس میں سے کتنے ہی پیسے نکال لیتا، دولت میں کمی نہ آتی۔

ایک روز صُبح ہی صُبح ایک بُوڑھا کُچھ چیزیں فروخت کرنے کے لیے چانگ کی دُکان پر آیا۔ یہ چیزیں زیادہ قیمتی نہ تھیں۔ بس یہی کوئی ایک سو پیسوں کی ہوں گی۔

چانگ نے اُن چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اُس کے ماتھے پر دکان داروں کی طرح بل پڑے ہُوئے تھے۔ پھر اُس نے جھُوٹ مُوٹ کھانستے ہُوئے بُوڑھے سے پوچھا:

"بڑے میاں، کیا دُوں اِن کا؟"

”تین پیسے۔“ بُوڑھے نے اس طرح کہا جیسے تین پیسے بُہت بڑی دولت ہوں۔

چانگ نے مُشکل سے حیرت پر قابُو پایا کیوں کہ وہ کوئی گھاگ کباڑیا تو تھا نہیں۔ پھر بھی اُس نے چہرے کو سنجیدہ بنائے رکھا اور اپنے گلے میں سے تین پیسے نکال کر بُوڑے کو تھما دیے۔ پھر بوڑھے کی چیزوں کو ایک تھیلے میں ڈال کر مکان نے پچھلے حصّے میں ڈال دیا۔

اُسے اُمّید تھی کہ بڑے میاں ابھی تک کھڑے ہوں گے، کیوں کہ اُس نے چیزیں بُہت ہی سستے داموں خریدی تھیں۔ ہو سکتا تھا کہ بُوڑھا اِرادہ بدل دے۔ لیکن نہیں۔ بُوڑھا چلا گیا تھا۔ اور اُسی دن سے گلے میں پیسے بڑھنے بند ہو گئے۔ اب چانگ گلّے میں سے دس پیسے نِکالتا تو دس کم ہو جاتے۔ دس اور نِکال لیتا تو بیس کم ہو جاتے۔ بڑے میاں نے اپنے برکت والے تین پیسے واپس لے لیے تھے۔

بھُوت بنگلا

ایک دفعہ کا ذکر ہے، کسی شہر میں دو بھائی اپنی بیوہ ماں کے ساتھ رہتے تھے۔ کسی زمانے میں اُن کی حالت اچھی تھی، لیکن اب تو وہ اس قدر غریب تھے کہ بعض وقت گھر میں فاقے کی نوبت آجاتی۔

بے چاری بُوڑھی ماں ہر وقت بد بختی کا رونا روتی رہتی اور اُٹھتے بیٹھتے کہتی۔ "اگر حالات ٹھیک نہیں ہوتے تو بہتر ہے کہ ہم لوگ مر جائیں۔ یوں گھُٹ گھُٹ کر جینے سے تو موت ہزار درجے بہتر ہے۔ مُجھے کیا، میری تو بُری بھلی گُزر گئی۔ بُڑھیا ہوں، دنیا کی خوشیاں مل بھی جائیں تو میرے کِس کام کی۔"

وُہ اپنے بیٹوں کو سمجھاتی۔ ”بیٹا، تُمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ حیران ہُوں کہ تُم لوگ کوشش کیوں نہیں کرتے کہ روپے پیسے کا بندولست ہو سکے۔ اپنے ہمسائے چِن کو دیکھو۔ اچھّے سے اچھّا کھاتا پیتا ہے۔ نوکر چاکر آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اُس کے پاس گاڑی بھی ہے۔ جینے کا صحیح طریقہ یہی ہے۔“

بڑا بیٹا ”لی ٹا“ ان تمام باتوں کا ایک ہی جواب دیتا۔ ”ماں، جو آپ کہتی ہیں بالکل میں ہے. ہمارا ہمسایہ چِن مال دار اور خوش حال ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ نوجوانی میں اُس نے سخت محنت کی ہو گی۔ لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پیسا کمانے کے لیے بسم اللہ کیسے کی جائے؟ مُرغا چُرانے تک کے لئے ہاتھ میں دانہ دُنکا چاہیے۔“

اس قسم کی بحث کے بعد ایک دن لی ٹا نے ماں سے کہا۔ ”ماں، میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ آپ کہتی ہیں چِن کے پاس بڑی دولت ہے۔ کیا وہ ہمیں دس روپے اُدھار دے رہے گا؟ دس روپے مل جائیں تو میں اور بھائی ”لی سی“ دو روپے آپ کو دے دیں گے اور آٹھ روپے لے کر کہیں قسمت آزمائی کرنے نِکل جائیں

گے۔ پیسا لگا کر ہی نفع کمایا جا سکتا ہے۔ ماں نے سوچا تجویز تو اچھّی ہے۔ وہ اپنے ہمسائے چِن سے روپے قرض لینے چلی گئی۔

چِن نیک دل آدمی تھا۔ اُس نے بڑی خوشی سے دس روپے لی خاندان کو اُدھار دے دیے۔ لی گھرانے میں رونق آ گئی۔ بڑے بھائی لی ٹا نے دو روپے ماں کے حوالے کیے۔ باقی آٹھ روپے بھُنوا کر آٹھ سو پیسے لے لیے، اور ان پیسوں کو تھیلے میں بھر دیا۔ چھوٹے بھائی لی سی نے تھیلے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی نیّت ٹھیک نہیں تھی۔

دوسرے دن صُبح سویرے دونوں بھائی سفر پر روانہ ہو گئے۔ چھوٹے بھائی لی سی نے سامان اُٹھایا اور لی ٹا نے پیسوں کا تھیلا۔

لیکن مکّار لی سی کو یہ بات پسند نہ آئی کہ میرا بھائی پیسوں والا تھیلا اُٹھائے۔ ابھی وُہ پانچ فرلانگ چلے ہوں گے کہ لی سی نے کہا :

"بھیا، تھیلا کافی بھاری ہو گا۔ لائیے، میں اُٹھا لیتا ہُوں۔ آپ تھک گئے ہوں گے۔ آپ سامان اُٹھا لیجیے۔ یہ کُچھ ہلکا ہے۔"

لی ٹا نے مُسکرا کر جواب دیا: ”نہیں۔ مُجھ میں اسے اُٹھانے کی ہمّت ہے۔ یُوں بھی بڑے بھائی کو چھوٹے سے زیادہ بوجھ اُٹھانا چاہیے۔ تُم فکر نہ کرو۔“

لی سی بڑے بھائی کے مُنہ پر اُس کی جھُوٹ مُوٹ تعریف کرتا کُچھ دُور چلا گیا۔ لیکن وُہ بار بار کہتا تھا کہ بھائی، بوجھ بدل لو۔ بُہت ضد کی تو لی ٹا راضی ہو گیا اور پیسوں کا تھیلا لی سی کو دے دیا۔

ابھی زیادہ فاصلہ طے نہیں ہُوا تھا کہ لی سی دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑ کر زمین پر لیٹ گیا اور مکّاری سے تڑپنے اور چیخنے لگا :

”بھیّا، کُچھ کیجیے۔ کہیں سے گرم پانی لے آیئے۔ میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔“

لی ٹا کو شُبہ تک نہ ہوا۔ وہ پریشان ہو کر گرم پانی کی تلاش میں دوڑا تا کہ بھائی کے درد کا علاج کر سکے مگر بے کار۔ سڑک پر گرم پانی کہاں سے آتا۔ لی ٹا کو سخت مایوسی ہُوئی۔ ذرا اور آگے گیا تو کھیتوں میں کام کرتی ایک بُڑھیا نظر آئی۔ جب اُس نے چھوٹے بھائی کی بیماری کا اُس عورت سے ذِکر کیا تو وہ فوراً ایک پیالی گرم

چائے کی لے آئی۔ لی ٹا چائے کی پیالی لیے تیز تیز قدم اُٹھاتا اُس جگہ پہنچا، جہاں چھوٹے بھائی لی سی کو چھوڑ گیا تھا۔ وہاں لی سی کا نام نشان تک نہ تھا۔ لی ٹا نے اُسے اِدھر اُدھر تلاش کیا اور جب ہر طرف دیکھنے کے بعد بھی وہ کہیں نہ ملا تو اُس نے سوچا:

"اس کا درد ٹھیک ہو گیا ہو گا اور وہ مُجھے ڈھونڈنے گیا ہو گا۔ اچھا، میں یہ پیالی بُوڑھی عورت کر دے آؤں۔ پھر لی سی کی تلاش میں نکلوں گا۔"

وُہ بھائی کی تلاش میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا لیکن وہ اُسے کہیں دِکھائی نہ دیا۔ سہ پہر گُزر گئی۔ دُھوپ کی تپش کم ہو گئی۔ شام کا دُھندلکا پھیلنے لگا۔ چاند نے اپنی نُورانی کرنوں سے اُجالا کر دیا۔ لی ٹا پریشان تھا کہ اب رات کہاں بسر کرے۔

اُسی وقت سڑک سے ذرا ہٹ کر اُسے بیدِ مجنوں کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ لی ٹا نے دیکھا کہ وہاں ایک بنگلا بنا ہُوا ہے۔ جب وہ قریب گیا تو پتا چلا کہ بنگلا بالکل خالی ہے۔ یہ گھر اصل میں بھُوت بنگلا کہلاتا تھا۔ لی ٹا نے سوچا۔ "اور کہاں جاؤں۔ رات یہیں بسر کر لیتا ہُوں۔"

لی ٹا اندر چلا گیا۔ مکان کی پہلی منزل نہایت گندی تھی۔ اُس میں کوڑا کرکٹ پھیلا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل میں پہنچا۔ یہ آرام کرنے کے لیے اچّھی اور صاف ستھری جگہ تھی۔ لی ٹا ایک کونے میں لیٹ گیا اور سردی سے بچاؤ کے لیے پردے اُتار کر اوڑھ لیے۔

وہ لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا اور خرّاٹے لینے لگا۔ کُچھ دیر بعد عجیب و غریب آوازوں نے اُسے جگا دیا۔ کوئی کہہ رہا تھا:

"بھئی، یہ تو کوئی اچّھی جگہ نہیں۔ یہاں تو کھانے کو بھی کُچھ نہیں۔"

دُوسرے نے کہا۔ "دیکھو، میرے پاس ایک چھڑی ہے۔ جب میں یہ چھڑی فرش پر ماروں گا تو قسم قسم کے لذیذ کھانے ہمارے سامنے آ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر اُس نے زمین پر چھڑی ماری۔ اب لی ٹا کو ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے بُہت سے لوگ کُچھ کھا پی رہے ہوں۔ جب وہ کھانا ختم کر چُکے تو اُن میں سے ایک بولا:

”یہاں سے عَین مشرق میں ایک کنُواں ہے، لیکن نہ معلُوم اُس کنُویں کا پانی اتنا کھاری کیوں ہے کہ کوئی پی ہی نہیں سکتا۔“

دُوسرا فوراً بول اُٹھا۔ ”معمُولی بات ہے۔ کنُویں کے قریب چِیڑ کا درخت ہے۔ اگر اِس درخت کو اُکھیڑ دیا جائے تو اُس کی جڑ میں سے زہریلا سبز ناگ نکلے گا۔ اس ناگ کو مار دیا جائے تو چشمے کا پانی میٹھا ہو جائے گا۔“

پھر ایک نئی آواز آئی۔ ”ہاں، اگر اس جگہ سے مغرب کی طرف جائیں تو وہاں ایک پُل ہے جسے راج مزدُور بارہ برس سے بنا رہے ہیں، لیکن نہ جانے وہ مکمّل کیوں نہیں ہوتا؟“

”مَیں بتاتا ہوں۔“ ایک اور آواز آئی. ”اُس پُل کے نیچے چار گھڑے چاندی اور چار گھڑے سونا دفن ہے۔ یہ پُل تب ہی مکمّل ہو سکتا ہے اگر اِن سونے چاندی کے گھڑوں کو نکال لیا جائے۔“

اتنی باتیں سُن کر لی ٹا کو پھر نیند آ گئی۔ ہو سکتا ہے بھُتنوں نے اِس کے علاوہ بھی کُچھ باتیں کی ہوں۔

جب لی ٹا کی آنکھ کھُلی تو دِن کافی چڑھ گیا تھا۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں دھوپ پھیل رہی تھی۔ دروازہ چوپٹ کھُلا تھا اور بھُتنے جا چُکے تھے۔

لی ٹا کو بڑے زور کی بھُوک لگی تھی۔ وُہ اُٹھا، کھانا تلاش کیا، لیکن کُچھ نہ ملا۔ کمرا بالکل خالی تھا۔ صرف سٹول پر ایک چھڑی پڑی تھی۔ لی ٹا نے سوچا، ہو نہ ہو یہ وُہی جادُو کی چھڑی ہے جس سے بھُتنے نے کھانا منگوایا تھا۔ اس نے چھڑی پکڑ کر زور سے زمین پر ماری۔ ایک لمحے میں پکے پکائے مزے دار کھانے اُس کے سامنے آ گئے۔

لی ٹا نے خُوب جی بھر کے کھایا پیا۔ ایسا مزے کا کھانا کھاتے ہُوئے اُسے چھوٹے بھائی کی یاد برابر آتی رہی۔ جانے اُس نے کُچھ کھایا بھی تھا یا نہیں۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی وُہ دوبارہ اپنے بھائی کو ڈھونڈنے نِکل کھڑا ہوا۔ چلتے چلتے سُورج سر پر آ گیا۔ گھاس پر پڑی شبنم اُڑ گئی۔ دھوپ کی تپش ہر طرف پھیل گئی۔ راستے میں لی ٹا نے دیکھا کہ ایک بُوڑھی عورت کُنویں سے پانی نِکال رہی ہے۔ اُس نے بُڑھیا سے پینے کے لیے پانی مانگا تو بُڑھیا نے جواب دیا۔ ”یہ پانی

بُہت کڑوا ہے۔ پینے کے قابل نہیں۔ بس اِس سے تو کھیتوں کو سیر اب کیا جا سکتا ہے۔"

لی ٹا نے گردن گھُما کر دیکھا۔ چیڑ کا درخت پاس ہی تھا۔ اُس نے عورت سے کہا:

"امّاں، اگر آپ اِس درخت کو کاٹ دیں اور اِس کی جڑ اُکھاڑیں تو آپ کو ایک زہریلا سبز سانپ نظر آئے گا۔ اس سانپ کو مار دینا۔ کنویں کا پانی میٹھا ہو جائے گا۔"

بُڑھیا نے لی ٹا کا شکریہ ادا کیا اور اُس کا نام پتا پُوچھا۔ لی ٹا نے اپنا اور اپنے گاؤں کا نام بتایا اور اُسی طرح پیاسا آگے بڑھ گیا۔

اب یہ سڑک مغرب کی طرف مُڑ گئی۔ چلتے چلتے ایک جگہ پُل آ گیا۔ اس پُل کو بہت سے راج مزدُور بنا رہے تھے۔ لی ٹا نے اُن میں سے ایک سے پُوچھا:

"اس پُل کو بنتے کتنا عرصہ ہو گیا؟" "کوئی بارہ سال ہو چُکے ہیں۔" ایک مزدُور نے بے زاری سے جواب دیا۔ دوسرا بولا:

"تُم یہ جان کر حیران ہو گے کہ ہم اس کو مکمّل کرتے ہی ہیں کہ یہ پھِر گر جاتا ہے۔"

لی ٹا نے تمام مزدُوروں کو پاس بُلا لیا اور کہا۔ "اِس پُل کے نیچے چار چاندی کے اور چار سونے کے گھڑے گڑے ہُوئے ہیں۔ ان کو نِکال لو گے تو پُل مکمّل ہو جائے گا۔"

راج مزدُور یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور لی ٹا سے اُس کا نام پتا پُوچھا۔

لی ٹا نے نام پتا بتا کر اپنی راہ لی۔

تھوڑا سا چلنے کے بعد اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کہاں ہے۔ اصل میں وہ اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

سب سے پہلے اُس نے ساری کہانی اپنی ماں کو سُنائی اور بتایا کہ ایک بنگلے میں اُس کی ملاقات بھُتنوں سے ہوئی تھی۔ ماں کو یقین نہ آیا تو لی ٹا نے چھڑی فرش پر ماری۔ واہ وا! پلک جھپکتے میں طرح طرح کے کھانے اُن کے سامنے آ گئے۔ اب

ماں کو یقین آیا کہ اُس کا بیٹا سچ مُچ بھُتنوں سے مل کر آیا ہے۔

لیکن کھانا کھاتے ہُوئے ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اصل میں اُسے اپنے چھوٹے بیٹے کا خیال آ گیا تھا۔ نہ معلُوم وہ کہاں مر گیا ہو گا؟ اُس نے کُچھ کھایا پیا بھی ہو گا یا نہیں !

اب لی ٹا کے چھوٹے بھائی لی سی کی سُنیے کہ وہ کیا گُل کھلا تا رہا۔ اُس نے چوری کے آٹھ روپوں سے خُوب عیش کیے۔ اُسے ایک بار بھی اپنے بڑے بھائی لی ٹا کا خیال نہ آیا۔ جس کو وہ جنگل میں اکیلا چھوڑ آیا تھا۔ اُسے تو بس گھُومنے پھرنے اور آوارہ گردی سے کام تھا۔ کئی برس گُزر گئے۔ لی ٹا اور اُس کی ماں جادُو کی چھڑی کو حکم دیتے، کھانا آ جاتا۔

اس دوران میں کڑوے پانی کے میٹھا ہو جانے اور بارہ برس بعد پُل کے مکمّل ہونے کی کہانی دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ ہوتے ہوتے یہ بات چین کے بادشاہ کے کانوں تک پہنچی۔

اب بادشاہ کو اُس عقل مند آدمی کی تلاش ہوئی جس نے کڑوے پانی کو میٹھا

کرنے کی ترکیب بتائی تھی اور گِرتے پُل کو مکمّل کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔

آخر بادشاہ کے آدمیوں نے لی ٹا کا کھوج نکالا اور اُسے شاہی دربار میں لے گئے۔ بادشاہ نے اُس کو ڈھیروں دولت دی۔ اُن لوگوں نے بھی خُوش ہو کر اُس کو انعام دیا، جِن کے کنویں کا کڑوا پانی میٹھا ہو گیا تھا اور جِن کا گِرتا پُل بن گیا تھا۔

دولت پا کر لی ٹا امیر ہو گیا۔ عزّت اور عیش و آرام سے رہنے لگا۔ وہ رحم دل تھا اِس لیے غریبوں کو اپنے ہاتھ سے خیرات دیا کرتا تھا۔

ایک دِن اُس کے محل کے دروازے پر بھکاریوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ خیرات دیتے دیتے اُس نے اپنے چھوٹے بھائی لی سی کو پہچان لیا۔ لی سی کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ سُوکھ کر ہڈّیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔

بڑے بھائی نے دُوڑ کر چھوٹے بھائی کو گلے لگا لیا اور اندر لے گیا۔ نہلایا، دھلایا، قیمتی کپڑے پہنائے، اچھّے اچھّے کھانے کھلائے اور پھر پُوچھا:

”پیارے بھائی، اِتنے سال کہاں گُزارے؟ مُجھے ڈُھونڈتے ڈُھونڈتے تُم پریشان

ہو گئے ہو گے اور سوچتے ہو گے کہ میرے بھیّا کے پاس تو ایک پیسا بھی نہیں۔"

لی سی نے جھُوٹ مُوٹ کہا۔ "بھائی جان، آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں کتنا پریشان تھا۔ یہ خیال مجُھے ہر وقت ستاتا رہتا کہ آپ میرے ساتھ نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ میں اپنے بڑے بھیّا کے بغیر آٹھ روپے سے سولہ روپے، سولہ روپے سے بتیس روپے اور بتیس سے چونسٹھ روپے کیسے کماؤں گا۔ بس میرا دِل ٹُوٹ گیا اور میں نے تجارت کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں نے سوچا، میرا بھائی نہیں تو میں اِن روپوں کا کیا کروں گا۔ ان کو بڑھانے کے بجائے گھٹانا چاہیے۔ پھر میرے پاس آٹھ روپے کے بجائے چار روپے رہ گئے۔ اور جب چار سے دو اور دو سے ایک رہ گیا تو میں نے جلدی سے اُسے بھی خرچ کر دیا کہ ایسا نہ ہو، کھو جائے۔"

لی سی نے یہ کہانی اس طرح سُنائی کہ لی ٹا ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ اب اور پُوچھنے کی کیا ضرُورت تھی۔

لی سی نے لی ٹا کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اُس سے پُوچھا۔ "آپ نے تو تجارت میں خُوب کمایا ہے۔"

لی ٹا نے بتایا۔ ”نہیں۔ میں نے تجارت تو کی ہی نہیں۔ یہ سب بھُتنوں کی کرامات ہیں۔“ پھر اُس نے چھوٹے بھائی کو ساری کہانی سُنا دی۔

لی سی یہ کہانی سُن کر بہُت خُوش ہُوا۔ بھُتنوں کی کرامت والی بات اُسے خاص طور پر پسند آئی۔ اُس نے دِل میں پکّا اِرادہ کر لیا کہ وہ بھی اُن بھُتنوں کے بنگلے میں جائے گا اور ڈھیر ساری دولت اکٹھّی کر کے لائے گا۔

ایک دن بڑے بھائی کی آنکھ بچا کر، وُہ چُپکے سے نِکل کھڑا ہوا اور تیز تیز چلتا اُسی جنگل میں جا پُہنچا جہاں بھُوت بنگلا تھا۔ وُہ سِیدھا اُوپر کی منزل میں چلا گیا اور ایک کونے میں چھُپ کر بیٹھ گیا۔

شام ہوئی تو بھُتنے آئے اور کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ ایک بھُتنے نے کہا :

”افسوس! ہم اُس بد معاش کو نہیں پکڑ سکے، جِس نے ہماری جادُو کی چھڑی چُرائی ہے۔ وہ چھڑی تھی تو کھانا پکانے کی بک بک نہیں کرنی پڑتی تھی۔ آرام سے مزے دار کھانے کھایا کرتے تھے۔“

اُن میں سے ایک نے آہ بھری۔ یہ اصل میں چھڑی کا مالک تھا۔ وہ بولا۔ ”آہ! وُہ بدمعاش جس نے میری چھڑی چُرائی ہے اب یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن ہمیں تلاش جاری رکھنی چاہیے۔ چلو، چل کر اُسے ڈھونڈیں۔“

بھُتنے کھڑے ہو گئے اور پھر ایک دم لی سی کی طرف بڑھے۔ لی سی نے سانس روک لی۔ بھُتنوں نے اُس کی چادر کھینچ کر پرے پھینک دی، جس میں وُہ چھُپا بیٹھا تھا اور اُسے پکڑ کر کمرے کے بیچ میں لے آئے۔

”آخر پکڑا گیا؟ وہی بدمعاش ہے جِس نے میری جادُو کی چھڑی چُرائی تھی۔“

چھڑی کا مالک غصّے سے گرج کر بولا اور لی سی کی ناک کو زور سے کھینچا۔ اب کیا تھا، سارے بھُتنے باری باری لی سی کی ناک پکڑ کر کھینچنے لگے۔ کھنچتے کھینچتے ناک گز بھر لمبی ہو گئی۔ لی سی نے بڑی مُشکل سے جان بچائی اور وہاں سے نِکل کر بھاگا۔

گھر پُہنچا تو لی ٹا یہ دیکھ کر سخت حیران ہُوا کہ لی سی نے ناک پر بڑا سا کپڑا باندھ رکھا ہے۔ لی سی کے بتانے پر وُہ فوراً بھُوت بنگلے پُہنچا۔

یا تو لی ٹا دیر سے پہنچا تھا یا پھر بھُتنے جلدی آ گئے تھے۔ کیوں کہ لی ٹا نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ بھُتنے تو وہاں پہلے سے موجود ہیں۔ وُہ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ ایک بھُتنا کہہ رہا تھا:

"بھئی، کل رات بڑا مزا آیا۔ میں نے آج تک ایسی ناک نہیں دیکھی، جو کھینچتی ہی چلی جائے۔ بے چارا لڑکا۔ اب گز بھر لمبی ناک لیے پھرتا ہو گا۔ ہاہاہا۔"

دوسرے نے کہا۔ "یار، اس لمبی ناک کا کوئی علاج بھی تو ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔" پہلے بھُتنے نے جواب دیا۔ "کسی کے پاس وہی جادُو کی چھڑی ہو تو وُہ چھڑی کو فرش پر مارتا جائے اور لمبی ناک والا جواب میں اپنا نام بولتا جائے۔ یہ عمل بارہ دفعہ دُہرانا ہے۔۔۔ ناک اپنی اصل شکل میں آ جائے گی۔"

اِتنا سُننا تھا کہ لی ٹا وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس نے جلدی سے گھر پہنچ کر لی سی کو تمام ماجرا سُنایا تو وہ بُہت خُوش ہُوا۔ لی ٹا نے جادُو کی چھڑی فرش پر ماری۔

"ٹپ۔۔۔"

لی سی نے کہا۔ ”میرا نام لی سی۔“

”ٹپ۔۔۔“

”میرا نام لی سی۔“

یہ عمل بارہ دفعہ دُہرا کر لی ٹا نے ہاتھ روک لیا۔ لیکن لی سی ہمیشہ کا لالچی اور ندیدہ تھا۔ وہ بولا :

”بڑے بھیّا، ایک بار اور۔“

”ٹپ۔۔۔“ لی ٹا نے چھڑی زمین پر ماری۔

”میرا نام لی سی۔“ یہ کہنا تھا کہ لی سی کی ناک جڑ سے اُکھڑ کر دُور جا گری اور وہ بے چارہ نکٹا رہ گیا۔

پکلا وانگ

اب آپ ایسے آدمی کی کہانی سُنیں گے جو بہُت ہی بدُّھو تھا۔ اس کا نام تھا وانگ۔ وہ دُور کسی گاؤں میں رہتا تھا۔

اس گاؤں تک ایک کچّی سڑک جاتی تھی اور وہ سڑک کے آخری سِرے پر آباد تھا۔ اس میں سے ہو کر کوئی راستہ کہیں نہیں جاتا تھا۔ بس یُوں سمجھ لیجیے کہ یہاں سے نہ کوئی راہ گیر گُزرتا، نہ کوئی قافلہ۔ نہ کوئی سوداگر مال بیچنے کی غرض سے آتا، نہ کوئی سرکاری ملازم دورہ کرنے آتا۔ بے چارے گاؤں کے لوگ باقی دنیا سے بے خبر زندگی بسر کرتے تھے۔ سبھی سیدھے سادے لوگ تھے مگر وانگ ان سب سے زیادہ سیدھا تھا۔ لوگ اُسے بدُّھو کہتے تھے۔

گرمیوں کی ایک صُبح کو، جب ہوا میں پھُولوں کی خُوش بو رچی ہوئی تھی، ابھی دِن کا اُجالا نہیں پھیلا تھا، ہاں چاند چمک رہا تھا، وانگ اپنے جھونپڑے کے سامنے شہر جانے کے لیے تیّار کھڑا تھا۔ کندھے پر بہنگی تھی اور بہنگی کے دونوں سِروں پر بانس کے ٹوکرے لٹک رہے تھے، جِن میں کوئلے بھرے ہوئے تھے۔

وانگ بے چارہ اس سے پہلے کبھی شہر تو کیا کہیں بھی نہیں گیا تھا۔ یہ تو اُسے اُس کی بیوی نے مجبور کیا تھا کہ وہ بھی پردیس چلا جائے اور کمائی کر کے لائے۔ اُس کی بیوی کو اُمّید تھی کہ سردی کا موسم آنے والا ہے، اگر وہ شہر جا کر کوئلے بیچے گا تو زیادہ روپے ملیں گے۔ وانگ کوئلوں کا بھاری بوجھ کاندھے پر لٹکائے، بوجھل قدموں کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کی بیوی کُچھ دُور تک اُسے چھوڑنے گئی۔ پھر واپس مُڑتے ہوئے بولی:

"دھیان سے جانا۔ بہت سی دولت کما کر لانا۔ اور میرے لیے تحفہ لانا مت بھُولنا۔"

وانگ کی بیوی بہت خُوب صُورت تھی اور وانگ اُس سے بہت پیار کرتا تھا۔ بیوی

کی بات سُن کر وانگ نے پُوچھا: ”کیا لاؤں؟“

بیوی خوشی سے جھُوم کر بولی ”ایک کنگھی۔“

”کنگھی؟ کیسی کنگھی؟“ جوش کے مارے وانگ کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ کنگھی کیسی ہوتی ہے۔

اس زمانے میں چین کے لوگ لکڑی کی ایسی کنگھیاں استعمال کرتے تھے جِن کی شکل آدھے چاند کی سی ہوتی تھی۔ وانگ کی بیوی کو اور تو کُچھ نہ سُوجھا، جھٹ سے آدھے چاند کی طرف اِشارہ کر کے بولی:

”ایسی۔۔۔“

”چاند جیسی۔ بہُت خُوب! اب یاد رہے گا۔“ وانگ نے کہا۔

بیوی نے وانگ کو خُدا حافظ کہا اور پلٹ آئی۔ وانگ کافی دیر تک چاند کو دیکھتا رہا تاکہ کنگھی کا نمُونہ اُس کے ذہن میں محفُوظ ہو جائے۔

راستے میں اُسے ہر چیز نئی اور عجیب لگتی۔ یُوں ہی چلتے چلتے ایک دِن وہ شہر پہنچ

گیا۔ چند دِنوں کے اندر اندر اُس کے کوئلے اچھّے داموں بِک گئے۔ اب اُس کی جیب میں خاصی رقم تھی اور کندھوں سے بوجھ بھی اُتر چُکا تھا۔

وہ خُوش خُوش شہر کے بازاروں کی سیر کرتا پھِر رہا تھا۔ اُس کے دونوں طرف رنگ برنگ جھڈیوں سے سجی ہوئی دُکانیں تھیں۔ دُکان دار اپنا مال بیچنے کے لیے زور زور سے ہانک لگا رہے تھے۔ جو بھی سُنتا اُس کی ہنسی چھُوٹ جاتی۔

یہاں گھُومتے گھُومتے وانگ کو اچانک خیال آیا کہ اُسے تو اپنی بیوی کے لیے تحفہ خریدنا ہے! اس خیال کا آنا تھا کہ وُہ چلتے چلتے رُک گیا۔ آنے جانے والے اُس سے ٹکرا ٹکرا کر گُزر رہے تھے۔ وانگ کو کُچھ ہوش نہ تھا۔ بس اُسے تو بیوی کے لیے تحفہ خریدنا تھا۔ خبر نہیں کیا لانے کو کہا تھا؟ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وُہ سوچ سوچ کر تھک گیا، تب کہیں جا کر اُسے یاد آیا کہ اس کی بیوی نے کوئی چاند سی چیز منگوائی تھی۔ اب جو نِگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دُکانوں کے چھجّوں نے بازار کو پُوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور آسمان بالکل نظر نہیں آتا تھا۔ وُہ بھاگتا ہوا بازار کے سِرے پر پہنچا، جہاں چاند اپنی پُوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ یہ پورا چاند تھا۔

وانگ چاند کو دیکھ کر خُوش ہو گیا اور خُود کو سمجھانے لگا "ہاں، کوئی گول گول سی چیز منگوائی تھی میری بیوی نے۔۔۔"

اب یہ گول چیز کیا ہو سکتی تھی؟ پریشانی سے سر کھجاتے ہوئے گول چیز کی تلاش میں اُس نے کئی دکانیں دیکھیں۔ اچانک اُس کی نظر ایسی چیز پر پڑی جو چاند کی طرح گول اور چمک دار تھی۔ وانگ نے دِل ہی دِل میں کہا :

"اب اس سے زیادہ گول چیز اور کیا ہو گی۔"

بغیر بھاؤ تاؤ کیے اُس نے دُکان والے کو پیسے دیے، اس کو سلام کیا، تحفے کا پیکٹ بندھوایا اور گاؤں کی راہ لی۔

وانگ نے جو تحفہ خریدا تھا وہ اصل میں آئینہ تھا۔ اُس نے کبھی زندگی میں آئینہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ کیا جانے آئینہ کیا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کے گاؤں والوں نے بھی آئینہ نہیں دیکھا تھا اور نہ اُس کے بارے میں کُچھ سنا تھا۔ گاؤں والے اُس سے مل ملا کر چلے گئے تو تنہائی میں اُس نے اپنی بیوی کو تحفہ دیا۔

بیوی خُوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ جھپٹ کر پیکٹ کھولا۔ یہ کنگھی نہیں تھی۔ وہ بہت مایوس ہوئی۔ آہیں بھرنے لگی۔ پھر صدمے سے اُس کی چیخیں نِکل گئیں۔ کیوں کہ آئینے میں بُہت ہی پیاری صُورت نظر آئی تھی۔

"ہائے ہائے! وانگ دُوسری بیری لے آیا۔ ہائے! میری سوکن لے آیا۔" وُہ روتی چیختی اپنے میکے چلی گئی اور جاتے ہی ماں کے گلے لگ کر بَین کرنے لگی۔

"امّاں! میری امّاں! وانگ دوسری دُلہن لے آیا۔ ہاے! میری، میری سوکن لے آیا۔"

یہ کہہ کر وانگ کی بیوی نے آئینہ اپنی ماں کے سامنے کر دیا۔

"دیکھو! امّاں دیکھو!"

ماں نے یہ عجیب شے اِحتیاط سے پکڑی اور غور سے اُس میں دیکھا۔ اور پھر اِطمینان سے بولی: "بیٹی، اگر تیرے شوہر کو دوسری شادی کرنا ہی تھی تو ایسی بُڈّھی چُڑیل سے کیوں کی؟"

ہوتے ہوتے یہ جھگڑا گاؤں کے مُکھیا تک پُہنچا۔ مُکھیا بھی ویسا ہی سیدھا سادہ تھا، جیسے گاؤں کے دوسرے لوگ تھے۔ اسے کیا معلُوم کہ آئینے میں اُسے اپنا ہی عکس نظر آ رہا ہے۔ اُسے گمان گُزرا کہ کوئی چالاک آدمی اُس کا بھیس بدل کر اُسے تنگ کرنے آیا ہے۔ اُس نے غصّے سے کہا :

بدمعاش کہیں کے۔ تُجھے یہ جرأت کیسے ہُوئی کہ تُو قانون کا مذاق اُڑائے اور میرے بھیس میں میرے سامنے آئے۔ "

پھر مُکھیا نے حکم دیا کہ وانگ، اُس کی بیوی اور بُڑھیا ساس کی کوڑوں سے خُوب پٹائی کرو تاکہ آیندہ ایسا مُقدّمہ کوئی لے کر نہ آئے۔

یہ تینوں دھڑادھڑ پِٹ رہے تھے کہ آئینہ فرش پر گِرا اور چکنا چُور ہو گیا۔

تین بونے

وُو ٹالِنگ بَونا جتنا بد شکل تھا خُدا نے اُسے اُتنا ہی پیارا دِل دیا تھا۔ اللہ میاں کِسی کو اچھی شکل دے دیتے ہیں اور کسی کو اچھا دِل۔ لیکن وُو ٹالِنگ کی بیوی تھی تو اُسی کی طرح بَونی ہی، پر بے حد خُوب صُورت تھی۔ نازک سی گُڑیا سی۔

یہ دونوں اکٹھّے باہر نکلتے تو لوگ اُنہیں دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ وُو ٹالِنگ کی بیوی کِن لِن نیلی گوٹ والی لال ریشمی گھگھری پہنے ہوتی اور اُس کی سفید صدری کی لمبی لمبی آستینیں لٹک رہی ہوتیں۔ نیلی ٹوپی اور کمر میں لال پٹکا۔ بس سجی بنی بندریا سی دکھائی دیتی۔

اس کے بالکل اُلٹ وُو ٹالِنگ کا لباس نہایت سادہ ہوتا۔ بھُورے رنگ کا لمبا کوٹ، گردن تک بٹن لگے ہوئے۔ وہ تیز تیز آگے چلتا اور بیوی اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں میں لکڑی کی کھڑاویں پہنے ٹپ ٹپ کرتی پیچھے بھاگ رہی ہوتی تو دیکھنے والے خُوب ہنستے۔

یہ خزاں کا موسم تھا اور صُبح کا وقت۔ بَونا بَونی سفر پر نِکل کھڑے ہوئے۔ کِن لِن آج پیدل چلنے کے بجائے چھوٹی سی ہتھ گاڑی میں اُکڑوں بیٹھی تھی۔ وُو ٹالِنگ گاڑی دھکیل رہا تھا۔ اصل میں وہ اپنا گاؤں چھوڑ کر کہیں دُور جانا چاہتا تھا، کیوں کہ اِس سال بارش نہ ہونے سے زمین سوکھ گئی تھی۔ وہ کھیت جہاں دھان کی سُنہری بالیاں جھُوم رہی ہوتی تھیں، ویران پڑے تھے۔ بے چارے وُو ٹالِنگ کا کھیت بھی سُوکھ گیا۔ تمام گاؤں والے پریشان تھے۔ اور جہاں کہیں پناہ مل رہی تھی، جا رہے تھے۔

وُو ٹالِنگ پورا زور لگا کر گاڑی دھکیل رہا تھا۔ گاڑی کھٹ چُوں، کھٹ چُوں، جھٹکے کھاتی چل رہی تھی۔ وُو ٹالِنگ نے جان بُوجھ کر پہیّوں کو تیل نہیں دیا تھا۔ اُس کا

خیال تھا کہ گاڑی کھٹ چُوں کھٹ چُوں چلے گی تو بھُتنے خوف ناک آوازیں سُن کر ڈر کے مارے قریب نہیں آئیں گے۔ کِن لِن بے چاری کھٹارا سی گاڑی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو جھٹکوں سے باہر گِر جائے۔

جس جنگل سے وُہ گُزر رہے تھے وہاں بھُوت رہتے تھے۔ اب بھُوت کھٹارا گاڑیوں سے ڈرنے لگیں تو بس ہو گیا کام۔ بھُوتوں نے جب دیکھا کہ وُو ٹالِنگ مزے مزے کھٹ چُوں کھٹ چُوں کرتا جارہا ہے۔ کوئی ڈر نہیں، خوف نہیں تو اُنہوں نے اُسے تنگ کرنے کے لیے ایک ترکیب سوچی۔

وُو ٹالِنگ گاؤں سے چند میل دور نِکل آیا تو اُس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک گاڑی چلی آرہی ہے۔ جب فاصلہ کم ہوا تو پتا چلا کہ ہُو بہُو اُسی کی گاڑی جیسی گاڑی ہے اور کوئی اُسی کی طرح اُسے مُشکل سے دھکیل رہا ہے۔

وُہ دِل ہی دِل میں خُوش ہُوا کہ چلو آنے والے مُسافر سے گپ شپ رہے گی۔ اس لمبی تنہا سڑک پر کوئی تو مِلا۔ خُدا کا شُکر ہے۔ اس بہانے کُچھ آرام کرلیں گے۔

یہ سوچ کر وُہ رُک گیا اور گاڑی کی ہتھّی کا سہارا لے کر آنے والے کا اِنتظار کرنے لگا۔ اُس کی سانس پھولی ہُوئی تھی۔ سر سے پاؤں تک پسینا بہہ رہا تھا۔ گاڑی کُچھ اور قریب آئی تو پتا چلا کہ گاڑی میں ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے اور ایک مرد اُسے دھکیل رہا ہے۔

حیرت سے وُو ٹالِنگ کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ اجنبی نے بالکل اُسی جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ اُسی کی طرح بَونا تھا اور اُسی کی طرح بدشکل بھی۔ کِن لِن لاحول پڑھنے لگی، کیوں کہ دوسری گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت بالکُل اُسی جیسی بَونی اور اُسی جسی خُوب صُورت تھی۔ اُس نے بھی نیلی گوٹ کی لال گھگھری پہن رکھی تھی اور اُس کی سفید صدری کی لمبی لمبی آستینیں لٹک رہی تھیں۔ اللہ رے! یہ تو کِن لِن ہی تھی۔ اُسے دھوکا ہونے لگا۔

وُو ٹالِنگ اور کِن لِن کی حیرانی انتہا کو پُہنچ گئی۔ کیسا سلام اور کیسا حال چال۔ اُن کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔ آخر آنے والا اجنبی خُود ہی بولا:

”جناب، مُجھ ناچیز کا نام ٹالِنگ ہے اور میں ”وو“ خاندان کا ہوں، اس لیے میرا پورا

نام وُو ٹالِنگ ہے۔ ہم یہاں سے چھ میل کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ اِس سے مِلیے۔
یہ میری بیوی ہے۔ اِس کا نام کِن لِن ہے۔"

اِتنا کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر مُسکرایا، اور پھر وُو
ٹالِنگ سے کہنے لگا:

"جناب، اب آپ مُجھے اپنا نام پتا بتائیں۔"

وُو ٹالِنگ نے مایوسی سے سر جھٹکا۔ اُس کی سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ کیا
بتائے۔ اُس نے کہا:

"ٹالِنگ تو میرا نام ہے اور وُو میرا خاندان ہے۔ یہاں سے چھ میل دُور میرا گاؤں
ہے اور میری بیوی کا نام کِی لِن ہے۔"

اجنبی نے غصّے سے لال ہو کر کہا۔ "یہ کیا بک بک ہے؟ میرا خیال ہے آپ کوئی
ٹھگ ہیں۔"

یہ کہہ کر اجنبی وُو ٹالِنگ کو مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ لڑائی سے ڈر کر دونوں

عورتیں اپنی اپنی گاڑیوں سے کُود پڑیں۔ نقلی عورت وُو ٹالِنگ کو

بچانے اُس کی طرف بڑھی، اور کِن لِن اجنبی کے راستے میں کھڑی ہو گئی تا کہ وُو ٹالِنگ کو مار نہ سکے۔ کِن لِن لڑائی جھگڑے سے بہت گھبراتی تھی۔ وُو ٹالِنگ صُلح کے انداز میں بولا :

"مارو مت بھائی۔ ہم صبر سے اس جھگڑے کو طے کر سکتے ہیں۔ چلیے، میں آپ کو بتاتا ہُوں۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ یہ میری بیوی ہے اور میں اس کا شوہر ہوں۔"

یہ کہا اور محبّت سے اپنے پاس کھڑی اجنبی عورت کو دیکھا۔

"نہیں نہیں۔" کِن لِن روتے ہُوئے وُو ٹالِنگ کے قدموں میں گِر گئی۔ "ایسا مت کہو۔ تُمہاری بیوی میں ہوں۔"

"تُمہاری بیوی تو میں ہوں۔" اجنبی عورت نے بھی اپنے آپ کو وُو ٹالِنگ کے قدموں میں گِرا دیا۔

بے چارہ وُو ٹالِنگ پریشان کھڑا تھا۔ کبھی ایک عورت کو دیکھتا، کبھی دوسری کو۔ یہ دیکھ کر اجنبی نے اُس سے کہا: ”میرا خیال ہے، ہم دونوں الگ چل کر بات کریں۔“

وُہ وُو ٹالِنگ کو درختوں کے جھُنڈ میں لے گیا۔ وہاں اُس نے وُو ٹالِنگ سے کوئی بات نہ کی۔ صرف اُس کی طرف دیکھ دیکھ کر مُسکراتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اُسے واپس سڑک پر لے آیا۔

جوں ہی وہ واپس آئے، دونوں عورتیں دَوڑ کر اجنبی کے قدموں میں گِر گئیں اور چیخنے لگیں:

”تُمھاری وفادار بیوی میں ہُوں۔ تُمھاری وفادار بیوی میں ہوں۔“

راہ چلنے والے تماشا دیکھنے کے لیے رُک گئے۔ اچھّی خاصی بھیڑ لگ گئی۔ سب نے منع کیا مگر کہاں۔ کون کِسی کی سُنتا ہے۔ لوگوں کی باتوں سے جھگڑا اور زیادہ بڑھ گیا۔

پھر تو یہ ہوا کہ وُوٹالِنگ کو خُود یُوں لگا کہ وُہ نقلی وُوٹالِنگ ہے۔ اصلی دُوسرا ہی ہے۔

آخر ایک عقل مند آدمی نے صلاح دی کہ بھئی معاملہ بُہت نازک ہے۔ بہتر ہو گا کہ تھانے چلیں۔ جو فیصلہ تھانے دار کرے اُسے مان لیا جائے۔ جتنے لوگ وہاں کھڑے تھے، سب نے اِس مشورے کو پسند کیا۔ دونوں بیویوں اور دونوں شوہروں نے بھی کہا :

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔"

یہ لوگ جس تھانے دار کے پاس پہنچے، وہ بھی بَونا تھا۔ اس عجیب سے مُقدّمے کو سُن کر وہ آگ بگُولا ہو گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ ڈھونگ اُس کا مذاق اُڑانے کے لیے رچایا گیا ہے۔ اُس نے دونوں بَونوں اور بَونیوں سے کئی سوالات کیے۔ لیکن جب معاملہ سُلجھنے کے بجائے اور اُلجھ گیا تو اُس کے غصّے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے حُکم دیا کہ اِن چاروں کو خُوب پیٹو۔ مار کھا کر کوئی نہ کوئی تو بول ہی دے گا۔

اُن کے سروں پر تڑاتڑ جُوتے پڑ رہے تھے۔ اُدھر سے ایک جج کی سواری گُزری،

جس کا نام پاؤ تھا۔ پاؤ بڑا ذہین اور عقل مند انسان تھا۔ اُس نے بَونوں کو اِس طرح پِٹتے دیکھا تو نوکروں کو حکم دیا کہ پالکی روک لو۔ پالکی سے اُتر کر وُہ تھانے دار کے پاس آیا، اور جب ساری بات سُنی تو وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا۔ اُسے شبہ ہُوا کہ چاروں میاں بیویوں میں ایک جوڑا ضُرور بھُتنوں کا ہے۔ پاؤ جانتا تھا کہ بھُتنے ہی ایسے تماشے کرتے ہیں۔ اُس نے بڑے رُعب سے کہا:

"میرا خیال ہے کہ اس معاملے کو طے کرنے کے کے بڑے جادُوگر کو بُلایا جائے، کیوں کہ مُجھے شک ہے کہ بھُتنے کُچھ گڑبڑ کر رہے ہیں۔ جادُوگر کے پاس ایک آئینہ ہے۔ جُوں ہی وُہ اُسے بھُتنوں کے سامنے کرے گا، وہ اپنی اصل شکل میں آجائیں گے۔"

اس سے پہلے کہ پاؤ اپنی بات ختم کرتا، بھُتنے غائب ہو گئے اور وہاں وُوٹالِنگ اور اُس کی بیوی کِن لِن کھڑے رہ گئے۔

اب یہ کوئی نہیں جانتا کہ اِتنا بڑا جادُوگر جِس کے پاس جادُو کا آئینہ تھا، سچ مُچ کہیں رہتا بھی تھا یا نہیں؟

وفادار بیوی

مینگ گھرانا اور چیانگ گھرانا ایک دُوسرے کے ہمسائے تھے۔ اِن دونوں خاندانوں میں بے حد محبّت اور میل جُول تھا۔ وہ ہر کام اکٹھّے کرتے اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ دونوں مکانوں کے درمیان ایک کچّی دیوار تھی، جس پر خُوب صُورت نیلی ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ دیوار دونوں گھروں کے باغوں کے بیچوں بیچ بنی ہوئی تھی۔

موسمِ بہار میں دونوں خاندانوں نے کدّو کی بیلیں لگائیں۔ ہلکی بارشوں کے بعد تیز بارشیں ہوئیں۔ کدّو کی بیلیں ہری بھری ہو گئیں۔ جب گرمی کے موسم نے اپنی گرمی دِکھائی تو یہ دونوں بیلیں پھیل کر دیوار پر چڑھ گئیں اور ایک دوسرے میں

پھنس کر ایک ہو گئیں۔ اب یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون سی بیل کِس کی ہے؟

پھر ان دونوں جُڑی ہوئی بیلوں میں ایک کدّو لگا۔ یہ کدّو بہُت بڑا تھا اور دونوں خاندانوں کو بہُت پسند تھا۔ لیکن اُنھیں اس بات کا بھی خیال نہیں آیا کہ یہ کدّو اصل میں کِس کی بیل میں لگا ہے۔

آخر وہ دِن بھی آ گیا جب کدّو پک کر تیّار ہو گیا۔ دونوں خاندانوں میں یہ فیصلہ ہوا کہ کدّو کو برابر برابر دو حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

جب مینگ نے کدّو کو ٹہنی سے کاٹا تو چیانگ خاندان کے لوگ دیوار پر سے بڑے شوق سے دیکھ رہے تھے اور پھر جب چیانگ اُسے دو برابر ٹکڑوں میں کاٹنے لگا تو مینگ خاندان کے لوگ بڑے اِطمینان سے اُس کو کٹتے ہُوئے دیکھنے لگے۔

جُوں ہی کدّو پر چاقو چلا، ایک بچّے کی باریک سی چیخ سُنائی دی۔

"جناب! ذرا اِحتیاط سے۔"

چیانگ ایک دم چونک گیا اور اُس کے ہاتھ سے کدّو چھُوٹ گیا۔ زمین پر ِگرتے ہی

کدُو کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اُس میں سے ایک مُنّی سی پری نِکلی۔

چیانگ خاندان اور مینگ خاندان کے لوگ اِس پری کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گئے۔ پھر اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ دونوں خاندان مل کر اِس پری کو پالیں پوسیں گے۔ یہ پری دونوں گھروں کی سانجھی بیٹی تھی، اس لیے اس کا نام دونوں کے نام پر ''مینگ چیانگ'' رکھا گیا۔

اس وقت چین پر چن شی ہو آنگ ائی نام کا ایک بادشاہ حکُومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ اِس قدر ظالِم تھا کہ اس کی مثال نہ ملتی تھی۔ یہی بادشاہ تھا جس نے وُہ مشہُور دیوار بنوائی، جس کو آج دنیا کے سات عجوبوں میں شُمار کیا جاتا ہے اور جو دیوارِ چین کے نام سے مشہُور ہے۔

چین کی ہُن قوم اُس وقت بڑی طاقت ور تھی اور چین کی جنُوبی سرحد میں اُس نے تباہی مچا رکھی تھی۔ شہنشاہ چِن شی ہو آنگ ائی چاہتا تھا کہ چین کو ان لوگوں سے بچایا جائے۔ سرحد پر اس نے تجویز کیا کہ چین کی جنُوبی سرحد پر ایک دیوار تعمیر کی جائے اور یہ دیوار مغربی پہاڑوں سے شروع ہو کر مشرق میں سمندر تک چلی

جائے۔

دیوارِ چین کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ نہ معلُوم اس کو بنانے کا طریقہ غَلَط تھا یا راج غفلت سے کام کرتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ جُوں ہی دیوار کا کُچھ حصّہ مکمّل ہوتا، دیوار دھم سے گر جاتی۔

شہنشاہ نے بے شمار راجوں کے سر کٹوا دیے اور بُہت سوں کو قید کر دیا، مگر سب بے کار۔ آخر ایک دن ایک آدمی بادشاہ کی خدمت میں پیش ہوا اور عرض کی :

"حضور، دیوار کو ہمیشہ قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہر میل کے فاصلے پر دیوار میں ایک آدمی زندہ چُن دیا جائے۔ اس طرح ہر میل پر دیوار کا ایک محافِظ مُقرّر ہو جائے گا۔"

دس ہزار میل لمبی دیوار میں چُننے کے لیے دس ہزار اِنسانوں کی ضرورت تھی۔ مگر اس ظالِم بادشاہ نے پروا نہیں کی۔ اگر دس ہزار کے بجائے ایک لاکھ اِنسان بھی مارنے پڑتے تو بھی

وُہ نہ ہچکچاتا۔

بادشاہ نے حکم دے دیا کہ فوراً دس ہزار آدمی اکٹھے کیے جائیں۔ اب کیا تھا، مُلک میں کُہرام مچ گیا۔ ہر شہر، ہر قصبے اور ہر گاؤں سے چیخ وپُکار سُنائی دیتی تھی۔

بادشاہ کا وزیر نہایت رحم دِل اور عقل مند آدمی تھا۔ اُس نے بادشاہ سلامت کے سامنے ایک اور تجویز پیش کی۔ اس نے کہا:

"حضور، جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔ میں نے سُنا ہے کہ کہیں ایک شخص رہتا ہے جِس کا نام وان ہے۔ وان کے معنی ہیں، دس ہزار انسان۔ اگر اُس ایک شخص کو حاصل کر لیا جائے تو اس کا مطلب ہو گا کہ دس ہزار آدمی مل گئے۔"

بادشاہ اس مشورے سے بُہت خُوش ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اِس طرح باقی نو ہزار نو سو ننانوے (۹۹۹۹) جانیں بچ جائیں گی بلکہ اِس لیے کہ ایک آدمی آسانی سے مل جائے گا۔ اُس نے وان کو پکڑ لانے کا حکم دے دیا۔ وان نے یہ خطرناک خبر سُنی تو وُہ بھاگ کھڑا ہوا اور دوڑتا ہوا دُور نِکل گیا۔ آخر دوڑتا دوڑتا وُہ مینگ اور چیانگ خاندانوں کے گھر پُہنچا۔ یہاں اُسے "مینگ چیانگ" مِلی جو اُس وقت تک ایک حسین عورت بن چُکی تھی۔

وان اور مینگ چیانگ نے ایک دُوسرے کو پسند کیا اور جلد ہی دونوں کی شادی ہو گئی۔

نکاح ہو چُکا تھا۔ دونوں خاندان دُولہا کے ساتھ بیٹھے شادی کی دعوت اُڑا رہے تھے۔ مینگ چیانگ دُلہن بنی الگ کمرے میں بیٹھی تھی کہ بادشاہ کے سپاہی وہاں پُہنچ گئے اور اُنہوں نے وان کو قید کر لیا۔ دونوں خاندان روتے اور منّتیں کرتے رہے۔ دُلہن بھی روتی پیٹتی آئی اور سپاہیوں کے قدموں میں گِر گئی۔ مگر اُن کی ایک نہ سُنی گئی۔ سپاہی وان کو پکڑ کر لے گئے تاکہ اُسے چین کی دیوار میں چُن دیا جائے۔

بے چارگی مینگ چیانگ کا رو رو کر بُرا حال ہو گیا۔ اُسے کِسی طرح چین نہ آتا تھا۔ اس حال میں کئی دِن گُزر گئے۔ آخر ایک دن اُس نے مینگ اور چیانگ خاندان کو خُدا حافظ کہا اور سفر پر روانہ ہو گئی۔

اپنے دُولہا کی تلاش میں اُس نے سینکڑوں میل کا سفر طے کیا۔ مگر افسوس! جب وہ دیوار کے پاس پُہنچی تو اس کی لمبائی کا کوئی حساب ہی نہ تھا۔ یہ دیوار میلوں

تک، پہاڑوں کی بُلندیوں اور میدانوں سے گُزرتی چلی گئی تھی اور کہیں اس کا سِرا دِکھائی نہ دیتا تھا۔ مینگ چیانگ کو کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اُس کا شوہر وان اس لمبی دیوار میں کہاں چُنا گیا ہے!

یہ خبر اُڑتی اُڑتی بادشاہ چِن شی ہو آنگ ائی کے کانوں تک پُہنچی کہ وان کی خُوب صُورت بیوی اپنے شوہر کی تلاش میں بھٹکتی پھر رہی ہے۔ بادشاہ نے سوچا، اس عورت کو دیکھنا چاہیے۔ اُس نے حکم دیا کہ اس عورت کو فوراً ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔

جب بادشاہ نے مینگ چیانگ کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اُس نے سوچا کہ میں اس کو اپنی ملکہ بناؤں گا، خواہ کُچھ بھی کرنا پڑے۔

مینگ چیانگ کو بادشاہ کے اِرادے کا پتا چلا تو اُس کے غصّے کی کوئی اِنتہا نہ رہی۔ مگر وہ بڑا ظالِم بادشاہ تھا۔ مینگ چیانگ صاف صاف اِنکار نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے کُچھ سوچ کر کہا:

”میں حضُور کی ملکہ بننے کے لیے تیّار ہوں۔ مگر پہلے میری تین شرطیں پوری کی

جائیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ میرے شوہر وان کی موت کا سوگ منایا جائے۔ یہ سوگ اُنچاس (۴۹) دِن جاری رہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ میرے شوہر کو عزّت کے ساتھ دوبارہ دفن کیا جائے۔ اُس کے جنازے میں بادشاہ سمیت تمام وزیر اور امیر شرکت کریں اور جنازے کو کاندھا دیں۔ تیسری اور آخری شرط یہ ہے کہ چین کے سب سے بڑے دریا کے کنارے ایک چبُوترا بنایا جائے۔ اُس چبوترے پر میں اپنے شوہر کے لیے قُربانی پیش کروں گی۔"

بادشاہ نے تینوں شرطیں منظور کرلیں۔ وان کی یاد میں تُمام مُلک میں سوگ منایا گیا، جو اُنچاس دِن تک جاری رہا۔ پھر وان کی میّت کو

دیوار میں سے نِکال کر عزّت کے ساتھ دوبارہ دفن کیا گیا۔ جب دریا کے کنارے چبوّترا تیّار ہو گیا تو مینگ چیانگ شان سے چلتی ہُوئی اُس پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے ظالِم بادشاہ کو بددُعائیں دیں اور پھر دریا میں کُود گئی۔

شہنشاہ کو مینگ چیانگ کی اِس حرکت پر بے حد غصّہ آیا۔ اُس نے مینگ چیانگ کی لاش دریا میں سے نِکلوائی اور پھر اُس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں ڈلوا

دیے۔ یہ ٹکڑے ننّھی مُنّی خُوب صُورت مچھلیاں بن گئے، جو ہمیشہ دریا کے کنارے تیرتی رہتی ہیں۔ چینی لوگوں کا خیال ہے کہ مینگ چیانگ ان ننّھی مُنّی خُوب صُورت مچھلیوں کی شکل میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

پھولوں کا عاشق

بُہت دِن ہوئے، چین کے کسی قصبے میں "سوان وی" نامی ایک شخص رہتا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا گھر بنایا اور اُس کے چاروں طرف اتنا خُوب صُورت باغ لگایا کہ بس دیکھنے سے تعلّق رکھتا تھا۔ اس باغ کے اندر اپنے صاف سُتھرے خاموش گھر میں، سوان وی تنہا رہتا تھا۔ وہ بُہت خُوش تھا۔ اُسے اپنے خُوب صُورت خیالوں سے محبّت تھی۔

باغ میں طرح طرح کے پھُولوں نے رونق لگا رکھی تھی۔ اس نیک آدمی کو باغ کی سیر کے سوا کُچھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ پودوں کی دیکھ بھال کرتا، پانی دیتا اور نلائی کرتا۔ یہ کام کرکے اُسے بڑی خُوشی ہوتی۔

ایک رات، چودھویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہوا خاموش تھی۔ سوان وی باغ کی سیر کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے چاند کی مدّھم روشنی میں اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکی شرمائی لجائی، اُس کی طرف بڑھ رہی ہے۔

یہ دیکھ کر سوان وی حیران رہ گیا، کیوں کہ آج تک کبھی کوئی شخص اُس کی اِجازت کے بغیر باغ میں داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ غور سے کھڑا دیکھتا رہا۔

لڑکی آہستہ آہستہ اُس کے قریب آ رہی تھی۔ اور پھر وہ چُپ چاپ اُس کے سامنے آ کر رُک گئی۔ اب وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اُس کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ صِرف لمبی سیاہ پلکیں ہلتی دِکھائی دے رہی تھیں، یا پھر اُس کی سانسوں کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

اس عُمر کی لڑکی جیسی ہونی چاہیے تھی، وہ ویسی ہی تھی۔ سوان کو تسلّی ہوئی۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور اتنی رات گئے باغ میں کیا کر رہی ہے؟

لڑکی نے اپنا چہرہ اُٹھایا اور جواب دیا:

"میں یہاں قریب ہی رہتی ہُوں۔ میں اور میری سہیلیاں خالہ فینگ سے ملنے آئی تھیں۔ آپ اجازت دیں تو ہم تھوڑی دیر کے لیے آپ کے باغ میں سستا لیں۔"

سوان نے خُوشی سے اُس کی درخواست مان لی۔ اُسی وقت لڑکی کی سہیلیاں بھی سامنے آ گئیں۔ وہ کہیں پاس ہی چھُپی ہوئی تھیں۔ یہ ہنستی ہُوئی نوجوان لڑکیاں رنگ برنگ لباس پہنے ہُوئے تھیں۔ ان سب نے سوان کو جھک کر آداب کیا اور باری باری اپنا تعارف کرایا۔

"میں بیدِ مجنوں ہُوں۔۔۔" ہرے کپڑوں والی لڑکی نے کہا۔

"میں آلو بخارا ہُوں۔۔۔" سفید لباس والی لڑکی نے بتایا۔

"اور میں گُلِ داؤدی ہوں۔۔۔" ایک پھُولی پھُولی لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔ اُس نے کاسنی رنگ کا جوڑا پہن رکھا تھا۔

کافی دیر تک وُہ اپنا تعارف کراتی رہیں۔ وُہ کوئی بیس پچیّس سہیلیاں تھیں۔ آخری

لڑکی نے لال جوڑا پہن رکھا تھا اور اس کا نام تھا انار کلی۔ اُس نے سوان وی کو بتایا:

"آج رات ہمیں اُمّید تھی کہ خالہ فینگ ہم سے ملنے آئیں گی۔ لیکن وہ نہیں آئیں۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم خود جا کر مِل آتے ہیں۔ چلتے چلتے اچانک خیال آیا، کُچھ دیر رُک کر آپ کو سلام کرتے چلیں، کیوں کہ آپ ہمیشہ ہم پر مہربان رہے ہیں۔

وُہ یہ کہہ ہی رہی تھی کہ خالہ فینگ بھی آ گئی۔ سوان کو اُسے دیکھتے ہی سردی لگنے لگی۔

سوان نے اُن سب کو دعوت دے ڈالی۔ اُس نے جلدی جلدی کھانے پینے کی کُچھ چیزیں تیّار کیں اور وُہ سب کھانے کی میز کے گِرد بیٹھ گئے۔

چاند پُوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سوان کا کمرا خُوش بُو سے بھرا ہوا تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ باغ کے تمام پھُول اُس کمرے کے اندر جمع ہو گئے ہیں۔

انار کلی نے شربت کا ایک بڑا سا گلاس بھرا اور خالہ فیگگ کو پیش کیا۔ پھر اُس نے

اپنے سُرخ لباس کو جھُلاتے ہوئے گانا گایا۔ اُس گانے میں کہا گیا تھا کہ سرد ہوا کو کوسنا بے کار ہے کیوں کہ جوانی یا بہار کو گُزرنا ہے، سو گُزرے گی۔ اس میں سرد ہوا کا کیا قصور؟

یہ گانا انار کلی کی سہیلیوں اور اُن کے میزبان سوان کو بہت پسند آیا۔ سب نے بڑے جوش سے کہا :

"بہُت خُوب! بہُت خُوب!"

لیکن خالہ فینگ نے کِسی قسم کی خُوشی کا اِظہار نہیں کیا۔

پھر آلُو بُخارا نے، جو چاندنی میں اور زیادہ سفید نظر آرہی تھی، گانا گایا۔ اس گانے کا مطلب بھی یہی تھا کہ جوانی کے دِن تھوڑے ہوتے ہیں۔ اس میں تیز ہوا کا کیا قصور؟

جب یہ گانا گایا جارہا تھا تو خالہ فینگ جو ابھی تک انار کلی کا پیش کیا ہُوا پیالہ سامنے رکھے بیٹھی تھی، بہت ہی اُداس نظر آنے لگی۔ اور جب آلُو بُخارا نے اپنا گیت ختم

کیا اور تمام سہیلیوں نے تالیاں بجائیں تو خالہ فینگ سخت اور روکھے لہجے میں بولی :

"میں نہیں سمجھ سکی کہ آپ نے اس خُوشی کی محفل میں اس طرح کے اُداس گانے کیوں سُنائے؟ یہ بھی نہ سمجھے کہ آپ نے میرے مُتعلّق جو کُچھ کہا، میرا دھیان اُدھر نہیں گیا۔ اب سزا کے طور پر انار کلی اور آلو بُخارا شربت کا بھرا ہُوا ایک ایک پیالہ پئیں گی اور پھر خوشی کا گیت سُنائیں گی۔"

یہ کہہ کر خالہ فینگ نے دو پیالے بھرے اور ان دونوں لڑکیوں کو پیش کیے۔

بدقسمتی سے ایک پیالہ چھلک گیا۔ اور سب سے بُری بات یہ ہوئی کہ شربت پھیل کر انار کلی کے سُرخ لباس پر گِر گیا۔ انار کلی اپنے لباس کا بُہت خیال رکھتی تھی، اور افسوس کہ کُچھ مغرُور بھی تھی۔

بجائے اس کے کہ ایک بزُرگ کی باتوں کو ہنسی خُوشی برداشت کرتی، اُسے غصّہ آ گیا اور وُہ خالہ فینگ سے بولی:

"دوسرے لوگ آپ سے ڈرتے ہوں گے۔ میں نہیں ڈرتی۔" یہ کہا اور تیزی سے باہر چلی گئی۔

خالہ فینگ ناراض ہو گئی۔ وہ میز پر سے اٹھی اور چیخی۔ ''یہ گُستاخ لڑکی کون ہے؟ اس کو کیسے جرأت ہوئی کہ میرے ساتھ اس طرح بات کرے؟ ''

دوسری لڑکیوں نے خالہ کا غصّہ دُور کرنے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے کہا :

''وہ لڑکی ناسمجھ ہے۔ وُہ ضرُور پچھتائے گی اور صُبح آپ سے معافی مانگ لے گی۔ ''

سوان نے بڑی بی کے مزاج کو ٹھنڈا کرنے کا جتن کیا۔ مگر کہاں؟ کوئی بھی اُس کے غصّے کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکتا تھا۔

خالہ فینگ غصّے سے پھُنکارتی باہر نِکل گئی۔ اُس کے پیچھے لڑکیاں بھی چلی گئیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جس کمرے میں لڑکیوں کے دم سے اِتنی رونق تھی، ایک دم خاموشی چھا گئی۔ چاند بھی ڈھل گیا تھا اور پھُولوں کی مست کر دینے والی خُوش بُو بھی ختم ہو گئی تھی۔ سوان وی چاہتا تھا کہ اپنے مہمانوں کو عزّت

کے ساتھ رُخصت کرے۔ وُہ بھی اُن کے پیچھے پیچھے باغ میں گیا۔ لیکن اندھیرا ہونے کی وجہ سے اُس کا پاؤں ایک پتھّر سے ٹکرایا اور گِر گیا۔ اِس سے پہلے کہ وہ

سنبھلتا، اُس کے مہمان جاچکے تھے۔

دُوسرے دن سوان سرِ شام اپنے باغ میں چلا گیا۔ یہ دیکھ کر اُسے بہت خوشی ہوئی کہ وہ لڑکیاں پہلے سے وہاں موجود تھیں۔ وہ انارکلی کو بُرا بھلا کہہ رہی تھیں اور اُس کو مجبور کر رہی تھیں کہ وہ جاکر خالہ فینگ سے معافی مانگے۔

انارکلی نے سوان کو آتے دیکھا تو وہ دوڑتی ہوئی اُس کے پاس گئی اور اُس کے پیچھے چھُپ کر سہیلیوں سے کہنے لگی:

"ہمیں خالہ فینگ سے معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمارا نیک دل مُحسن ہمیں بچا سکتا ہے۔"

یہ سُن کر تمام لڑکیاں خُوش ہو گئیں، باتیں کرتی ہوئی سوان کے پاس آ گئیں اور بڑی آس کے ساتھ اُس کو دیکھنے لگیں۔

سوان پہلے تو کُچھ گھبرایا، پھر گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے انارکلی سے کہا: "بی بی، میں آپ کو کیسے بچا سکتا ہوں؟"

”یہ تو بڑی آسان بات ہے۔“ انار کلی نے کہا۔ ”آپ کو صِرف یہ کرنا ہو گا کہ ایک بہت بڑا بادبان بنائیں۔ اس بادبان پر چاند، سورج اور سات ستاروں کا جھُمکا بنا دیں اور صُبح کے وقت جب پُروا ہوا چلے تو اُس بادبان کو باغ کے مشرق کی طرف تان دیں۔ اس طرح آپ ہمیں بچا لیں گے۔“

سوان رضامند ہو گیا۔ لڑکیاں چلی گئیں۔

راتوں رات سوان نے بادبان تیّار کیا اور اگلی صُبح جب پُروا نے پھُولوں کو ہولے سے چھُوا تو اُس نے جھٹ سے باغ کے مشرقی حصّے میں بادبان تان دیا۔

جلد ہی ہلکی ہوا نے زور پکڑ لیا اور تیز جھکّڑ چلنے لگے۔ باغ کے درخت اپنے پتّوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔ اِتنی تیز آندھی تھی کہ مکانوں کی چھتّیں اُڑ گئیں، درختوں کے تنے ٹُوٹ گئے اور ندیوں سے پانی اُچھل کر باہر آ گیا۔ لیکن سوان کا بادبان اُسی طرح سینہ تانے کھڑا رہا

اور سوان کے باغ کے درخت اور پورے تیز ہوا سے بالکل محفوظ رہے۔

سوان اب سمجھا کہ خالہ فینگ اصل میں پُروا ہوا تھی اور وُہ لڑکیاں حقیقت میں پھُول تھیں۔

جب طُوفان تھم گیا تو وہ لڑکیاں خُوشی سے ناچتی ہوئی سوان کا شُکریہ ادا کرنے آئیں۔ اُن سب رنگا رنگ لباس پہنے ہُوئے تھیں۔ اُن میں سے ہر لڑکی سوان کے لیے مُٹھی بھر پھُولوں کی پتّیاں لائی اور اُس کو دیتے ہوئے بولی :

"کھائیے۔۔۔"

انار کلی لال پُوشاک پہنے سب سے بعد میں آئی اور پتّیاں دیتے ہوئے بولی :

"ہاں ہاں۔۔۔ کھائیے۔" اُس کی آواز جھرنے کی طرح تھی۔ "ہاں ہاں۔ کھائیے۔ یہ بُڑھاپے کو آپ سے ہمیشہ دور رکھیں گی۔ "

اور جب بُوڑھے سوان نے اُن پتّیوں کو کھایا تو یقین کیجیے کہ وہ بالکل نوجوان نظر آنے لگا۔ چُوں کہ وہ بُہت ہی نیک دل تھا، اُس نے پاکیزہ زندگی بسر کی اور ایک دِن دیوتا بن گیا۔

دُلہن پری

بُہت زمانہ گزرا، چین کے کسی شہر میں چار بھائی رہتے تھے۔ سب سے بڑے بھائی کی شادی بادشاہ کی بیٹی سے ہونے والی تھی۔ اُس سے چھوٹے کی جرنیل کی بیٹی سے۔ تیسرے بھائی کی منگنی وزیر کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔ تینوں اپنی اپنی جگہ بُہت خُوش تھے۔

لیکن سب سے چھوٹے بھائی کا اِرادہ شادی کرنے کا نہیں تھا۔ اُس نے صاف کہہ دیا تھا کہ بیاہ کروں گا تو پری سے، نہیں تو کنوارا رہوں گا۔ اس پر باقی تین بھائی بُہت ہنسے۔ چھوٹے بھائی نے پروا نہیں کی۔ اُسے پتا تھا کہ جو کوئی یہ بات سُنے گا، ہنسے گا۔

ان تینوں بھائیوں کی شادی ایک ہی دِن، ایک ہی جگہ ہونا طے پائی۔ اور وہ جگہ شاہی محل تھی۔ کچھ نہ پوچھیے کیسی زبردست تیّاریاں ہو رہی تھیں۔ شادی کے روز محل امیروں وزیروں سے بھرا ہُوا تھا۔ رنگارنگ پوشاکیں محل کی شان و شوکت اور سجاوٹ کو دوبالا کر رہی تھیں۔ بُہت بڑی دعوت کا اِنتظام تھا۔

اس رونق اور گہما گہمی میں چھوٹے بھائی کا دِل بُجھا بُجھا سا تھا۔ وُہ ان خُوب صُورت نظّاروں کو بے دِلی سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس شور غُل سے تنگ کر وہ محل سے باہر نکل آیا۔ وہ چاہتا تھا شہر سے دُور، کھیتوں میں سیر کر کے دِل کا بوجھ ہلکا کرے۔

جس سڑک پر وُہ چل رہا تھا، وہ ایک پُل پر سے گزرتی تھی۔ یہ پُل ایک ندی پر بنا ہوا تھا۔ چھوٹا بھائی پُل پر کھڑا کافی دیر تک بہتے ہوئے پانی کو دیکھتا رہا۔ جب وُہ دوبارہ چلنے لگا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے ایک بُہت خُوب صُورت لڑکی کھڑی ہے۔ اُس کا رنگ ایسا گورا تھا کہ اُسے دیکھ کر چاند بھی شرما جائے۔ چھوٹے بھائی کو یقین ہو گیا کہ یہ عورت نہیں، پری ہے۔ اُس نے لڑکی سے کہا :

”کیا آپ مُجھ سے شادی کریں گی؟“ اور جب لڑکی نے کہا ”کروں گی“ تو وُہ خوشی سے پاگل ہو گیا۔

چھوٹے بھائی کو یہ خیال نہ آیا کہ یہ لڑکی ایک تن درست دیہاتن ہے اور اس کے ساتھ پیدل چل کر گھر پہنچ سکتی ہے۔

اُس نے سوچا کہ اُسے اچھّے گھرانوں کی دُلہنوں کی طرح ڈولی میں جانا چاہیے۔

”تم یہاں کھڑی رہنا۔ میں ڈولی لے کر ابھی آیا۔“

چھوٹے بھائی نے کہا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وُہ اِتنا تیز دوڑ رہا تھا کہ پاؤں زمین پر نہ لگتے تھے۔ محل میں پُہنچ کر ہانپتا ہوا مہمانوں کے پاس گیا اور شور مچا دیا:

”مجھے دُلہن مل گئی۔ مجھے دُلہن مل گئی۔“

مہمان کھانے پینے اور ہنسنے ہنسانے میں لگے ہوئے تھے۔ کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہ کی۔ آخر اس نے ڈولی اُٹھانے کے لیے چار نوکر بُلائے اور خُوشی خُوشی اپنی دُلہن پری کو لینے چلا گیا۔

پری وہیں کھڑی تھی، جہاں وہ اُسے چھوڑ گیا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی پری کو ڈولی میں بٹھایا اور بڑے بھائیوں کی شادی ہونے سے پہلے محل میں واپس آ گیا۔ لوگوں نے چھوٹے بھائی کی دیہاتی دُلہن کو دیکھ کر ناک بھُوں چڑھائی۔ پر اُس نے پروانہ کی۔

شادی کے دوسرے دن، چِین کی رسم کے مطابق چاروں دُلہنوں کو اپنے اپنے میکے جانا تھا۔ وزیر اور جرنیل تو بادشاہ کے محل ہی میں تھے۔ بڑے بھائیوں کی تینوں دُلہنیں تُحفے لے کر محل میں گئیں۔ اب چھوٹے بھائی کی دُلہن کہاں جائے؟ اس کا تو کوئی مَیکا نہیں تھا۔ باقیوں کے ساتھ وہ بھی محل میں چلی گئی۔

بادشاہ کی بیٹی نے چِین کی سب سے اچھّی چائے باپ کی خدمت میں پیش کی۔ دوسرے اور تیسرے بھائیوں کی بیویوں نے سب سے اچھّی تو نہیں، البتّہ بُہت مہنگی چائے اپنے اپنے ماں باپ کو تُحفے میں دی۔ چھوٹے بھائی کی دُلہن کے پاس عام سبز چائے تھی۔ جِٹھانیوں نے اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔

کُچھ ہی دن گُزرے تھے کہ نئے سال کا جشن آ گیا۔ اُس دن سارے بھائی اپنے

اپنے سُسرال سلام کرنے اور تُحفے پیش کرنے کے لیے گئے۔ بے چارے چھوٹے بھیّا کہاں جاتے! جی چھوڑ کر گھر بیٹھ رہے۔ دُلہن نے پُوچھا:

"آپ مبارک باد دینے محل میں کیوں نہیں گئے؟"

"میں کیسے جاؤں؟ غریب آدمی ہوں، تُحفے کہاں سے لاؤں؟" چھوٹے بھائی نے اُداسی سے جواب دیا۔ دُلہن پری مُسکرائی اور پھر بولی :

"میں بتاتی ہوں، آپ کیسے جائیں۔"

اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے تِنکوں کا گھوڑا بنایا اور اپنے مُنّے مُنّے پیروں میں بندھی ہوئی پٹّی سے ایک چیتھڑا اپھاڑ کر چھوٹے بھائی کو دیتے ہوئے بولی :

"اس گھوڑے پر سوار ہو کر سمندر کے کنارے چلے جایئے اور یہ چیتھڑا سمندر میں ڈال دیجیے۔"

چھوٹے بھائی نے ایسا ہی کیا، جیسے دُلہن پری نے بتایا تھا۔ تِنکوں کا گھوڑا اُسے لے کر دوڑنے لگا۔ سمندر کے کنارے پہنچ کر اُس نے چیتھڑا سمندر میں ڈال دیا۔ اُسی

وقت پانی میں ایک راستہ بن گیا جس پر تِنکوں کا گھوڑا آسانی سے دوڑ سکتا تھا۔ یہ گھوڑا چھوٹے بھائی کو کہاں لے گیا؟ یہ ہمیں پتا نہیں۔ جب وُہ پلٹا تو خُوشی سے مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چِین کی سب سے اچھّی چائے کا بڑا سا بنڈل تھا۔ یہ چائے بڑے بھائیوں کے سُسرال میں بانٹی گئی۔ اب کوئی بھی چھوٹی دُلہن کا مذاق نہیں اُڑاتا تھا۔

چِین میں نئے سال کے چودھویں دن نہایت خُوب صُورت اور قیمتی تُحفے ایک دوسرے کو دیے جاتے ہیں۔ تینوں بڑے بھائیوں کی بیویاں تُحفوں کی خریداری کے لیے چِڑیوں کی طرح چہکتی پِھرتی تھیں۔ چھوٹے بھائی نے جب یہ دھُوم دھام دیکھی تو اُس کا دِل ٹوٹ گیا۔ وُہ خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ دُلہن پری آئی اور بولی:

"سمندر کے کنارے جایئے۔ وہاں ایک صندوقچہ تیر رہا ہو گا۔ اُسے اُٹھا کر لے آیئے۔"

چھوٹا بھائی سمندر کے کنارے گیا۔ سچ مُچ سمندر میں لکڑی کا ایک صندُوقچہ تیر رہا

تھا۔ وُہ پائنچے اُوپر کیے پانی میں اُترا اور صندُوقچہ اُٹھا لیا۔ لیکن یہ تو لکڑی کا ایک معمولی سا صندُوقچہ تھا۔ چھوٹے بھائی کا خیال تھا کہ اُس کی بیوی ایسا تُحفہ دے گی جو چِین کی بہترین چائے سے بھی اچھّا ہو گا۔ اُس نے مایُوس ہو کر صندُوق واپس پانی میں پھینکا اور گھر لوٹ آیا۔ بیوی نے خوش ہو کر پُوچھا:

''صندُوقچہ لے آئے؟ ''

چھوٹے بھائی نے بیوی کو گھُورتے ہوئے جواب دیا۔ ''وُہ تو لکڑی کا ایک معمُولی سا ڈبّا تھا۔ بالکل بے کار۔ میں نے اُسے سمندر میں پھینک دیا۔''

دُلہن پری سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اُسے کیا معلُوم کہ آدم زاد ایسے ہوتے ہیں۔ مگر اُس نے شوہر کو بُرا بھلا نہیں کہا۔ مُسکرا کر اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور نرمی سے بولی:

''آپ واپس جائیے اور مُجھے وہی ڈبّا لا دیجیے۔''

چھوٹا بھائی دوبارہ گیا اور لکڑی کا صندُوقچہ لے آیا۔

چودھویں دِن سے پہلے شام کے وقت دُلہن پری نے صدو قچے کا ڈھکنا اُٹھایا تو چھوٹا بھائی حیرت سے چیختا ہُوا پیچھے ہٹ گیا۔

صندُو قچے کے اندر ایک دُنیا آباد تھی۔ ایک بہت بڑا شہر تھا، جِس میں لمبی لمبی گلیاں تھیں۔ بڑے بڑے محل تھے۔ دُکانیں سامان سے بھری ہُوئی تھیں۔ تھیٹروں میں ڈرامے ہو رہے تھے۔ جا بجا خُوب صُورت باغ تھے اور باغوں میں عجیب و غریب پھُول کھلے تھے۔ ہری بھری چراگاہیں تھیں، جن میں شیر، چیتے، ہاتھی اور اژدہے پھِر رہے تھے۔ اژدہوں کے سروں پر سینگ تھے اور مُنہ سے آگ برستی تھی۔

جب یہ دونوں میاں بیوی اس عجیب مُلک سے واپس آئے اور دُلہن پری نے صندُو قچے کا ڈھکنا بند کر دیا تو چھوٹے بھائی کو کتنی ہی دیر تک ہوش نہ آیا۔

اب کیا تھا۔ چھوٹے بھائی نے بڑے بھائیوں اور بھاوجوں کو یہ عُجوبہ دکھانے کے لیے بُلایا۔ دُلہن پری نے صندو قچے کا ڈھکنا اُٹھایا۔ وہی شہر اور وُہی بھری پُری گلیاں، جن میں لوگ رنگ برنگ لباس پہنے گھُوم پھِر رہے تھے۔ چھوٹے بھائی

کے بھائی اور بھاوجیں اندر چلے گئے۔ اُنہوں نے ہوٹل میں بیٹھ کر مزے دار کھانے کھائے۔ تلی ہُوئی مچھلی، مُرغ، بھُنی ہُوئی چِڑیاں، بطخوں کے پنجے، کیکڑے، انڈے، مونگ پھلیاں، اخروٹ، غرض دُنیا کی ساری نعمتیں پیٹ بھر کر کھائیں۔ کھا پی کر فارغ ہوئے تو تھیٹر میں چلے گئے۔ وہاں ایسا ڈراما ہو رہا تھا جو اُنہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گپیں لگاتے، کھاتے پیتے، مزے اُڑاتے صُبح ہو گئی۔

اب بجائے اس کے کہ چھوٹے بھائی کی بھاوجیں اُس کا شکریہ ادا کرتیں، وُہ جل بھُن کر رہ گئیں۔ اُن کے دِلوں میں چھوٹے بھائی کی بیوی سے حسد اور نفرت پیدا ہو گئی، کیوں کہ اُس کے پاس جو تُحفہ تھا اُس کی کہیں مثال نہ تھی۔ تینوں نے اُس کا ذکر اپنے اپنے باپ سے کیا تو اُن کا بھی وہی حال ہُوا جو بیٹیوں کا تھا۔

بڑے بھائیوں کو پھر اس جادُو کے ڈبّے کو دیکھنے کی خواہش ہُوئی۔ لیکن بادشاہ نے اُن کو جانے سے روک دیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُن کی جگہ وُہ خُود جا کر اُس عجیب صندُوقچے کو دیکھے گا۔ اُس کے جرنیل اور وزیر نے بھی اُسے یہی مشورہ دیا۔

بادشاہ دِل میں سوچ رہا تھا کہ اس صندُوقچے میں جو مُلک آباد ہے، میں اُس پر قبضہ کر لُوں گا۔

جرنیل سوچ رہا تھا کہ یہ صندُوقچہ جنگ کے لیے نہایت کار آمد ہو گا۔ اس جادُو نگری کے بادشاہ کے پاس بڑی سی فوج بھی ہو گی۔ میں جنگ جیتنے کے لیے اس سے مدد لُوں گا۔

وزیر نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے سوچا، اس شہر میں بُہت سے امیر لوگ رہتے ہوں گے۔ میں اُن پر ٹیکس لگاؤں گا اور اُس رقم میں سے بڑا حصّہ میری ہی جیب میں جائے گا۔

اپنی اپنی سکیموں پر غور کرتے، تینوں صندُوقچے کی سیر کرنے پُہنچے۔ بادشاہ کی سکیم سیدھی سادھی تھی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ چھوٹے میاں بادشاہ سے زیادہ عیش اور آرام سے رہیں۔ یہ ایسا جُرم تھا کہ چھوٹے بھائی اور اُس کی بیوی کو موت کی سزا ملنی چاہیے۔

جرنیل نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج کی مدد سے چھوٹے بھائی کی بیوی کو مروا دے گا۔

وزیر نے سوچا کہ وہ بادشاہ کو چھوٹے بھائی اور اُس کی بیوی کے بارے میں کوئی جھُوٹی کہانی سُنائے گا۔ اس طرح اُس کے کہنے پر بادشاہ اُن کو مُلک سے نکال دے گا اور اِتنی دُور بھیج دے گا جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آ سکیں گے۔ بادشاہ، جرنیل، وزیر، چھوٹا بھائی اور اُس کی بیوی صندُوقچے میں آباد شہر کو دیکھنے اندر چلے گئے۔ سب سے پہلے وہ محل میں گئے۔ محل میں کوئی بادشاہ نہ تھا جو اِستقبال کے لیے آتا۔ ہاں نوکر چاکر دوڑے بھاگے پھِر رہے تھے۔ تخت خالی پڑا تھا۔ بادشاہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ تخت پر بیٹھ گیا اور شربت لانے کا حکم دیا۔

پلک جھپکتے میں شربت حاضِر کر دیا گیا۔ بادشاہ غٹا غٹ پیالے پر پیالہ پینے لگا۔ درباری کھڑے دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ نے نہ تو اُنہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور نہ شربت پینے کی دعوت دی۔ اُس کو اِتنا ہوش کہاں تھا۔ وہ تو شربت پینے میں مصرُوف تھا۔

پیتے پیتے بادشاہ کے ماتھے پر سلوٹیں پڑنے لگیں۔ ہونٹ بھنچنے لگے۔ آنکھیں مچنے لگیں۔ وُہ سر کو جھٹکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بُزدل جرنیل اور بے ایمان وزیر

اِس جادُو کے ڈبّے کو ہتھیانے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ اگر یہ اپنی کوشش میں کام یاب ہو گئے تو کیا ہو گا؟ یہ مُجھے مار ڈالیں گے۔ اِس خیال کے ساتھ ہی اُس کی اُنگلیاں مُڑ گئیں اور چہرہ رنگ بدلنے لگا۔ اس نے فوج کے کپتان کو حکم دیا کہ ان دونوں کو قتل کر دو۔ ایک پَل میں دونوں کے سر تَن سے جُدا ہو گئے۔

اب بادشاہ کے سامنے صِرف چھوٹا بھائی اور اُس کی بیوی کھڑے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ بادشاہ شربت پیتا جاتا اور چور نظروں سے اُن کی طرف دیکھتا جاتا۔

اچانک دربار کے بڑے ہال میں کہیں سے پانی آنے لگا اور چکنے فرش پر پھیلنے لگا۔ پانی کی سطح ہولے ہولے اُونچی ہونے لگی، یہاں تک کہ پانی چھوٹے بھائی اور دُلہن پری کے ٹخنوں کو چھُونے لگا۔

تخت پر بیٹھے بادشاہ کو بالکُل معلُوم نہ ہُوا کہ ہال میں پانی آ گیا ہے۔ دُلہن پری نے چھوٹے بھائی کا بازو پکڑا اور اُسے ہال سے باہر کھینچ لائی۔ بادشاہ کو خبر تک نہ ہُوئی۔

محل سے نِکل کر وہ دونوں شہر کی گلیوں میں سے گُزرے جہاں گھُٹنے گھُٹنے پانی کھڑا

تھا۔ جادُو کے صندُو قچے میں سے باہر نکلنے تک پانی کمر تک پُہنچ چُکا تھا۔ صندُو قچے سے باہر آکر دونوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ دُلہن پری نے جھٹ صندُو قچے کا ڈھکنا بند کر دیا۔

بادشاہ تخت پر بیٹھا شربت پیتا رہا۔ پانی اُس کے ٹخنوں سے گھُٹنوں، گھُٹنوں سے کمر تک اور کمر سے سینے تک آ گیا، یہاں تک کہ اُس کے داڑھی کے بال پانی میں تیرنے لگے۔ اور پھر وُہ پانی میں ڈوب کر مر گیا۔

ہائے پیسا

یہ کہانی جو اب میں آپ کو سُنا رہا ہُوں ایک ایسی دولت کے بارے میں ہے جس کے متعلّق جاننا آپ کے لیے ضرُوری ہے۔ دولت مِلنے سے پہلے اس کا پتا ہو تو ٹھیک، ورنہ بے کار۔ پِھر کہانی سے حاصل کیا ہُوا سبق کِسی کام نہ آئے گا۔

چِین کی تاریخ بہُت پُرانی ہے۔ چِن پوشن، جس کا اِس کہانی میں تذکرہ ہے، آپ کو زندہ معلُوم ہو گا۔ مگر یہ بہُت پرانے زمانے کی بات ہے جب چن پوشن، چو آن چُو شہر میں بہُت بڑا کاروبار کرتا تھا اور اپنے وقت کا سب سے امیر سوداگر تھا۔

اُس کے پاس بے حد دولت تھی۔ مگر دولت مند ہونے کے ساتھ ساتھ وُہ نیک

دل اور عقل مند بھی تھا۔

اُس کی زندگی اِتنی مصرُوف تھی کہ خُدا کی پناہ! جب دُنیا والے میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہوتے وہ بستر سے نِکل آیا اور پھر تمام دِن کاروبار میں گزار دیتا۔ جِتنا پیسا، اُتنا ہی کام۔ وُہ تمام وقت لوگوں سے مُلاقات کرنے، کاروبار میں روپے لگانے، قرضہ حاصل کرنے اور قرضہ دینے، چیزوں کی خرید و فروخت، ٹیکس ادا کرنے یا ٹیکس بچانے کے چکّر میں پھنسا رہتا۔ اُسے رات کو بھی آرام نصیب نہ ہوتا تھا۔ رات کو کھانا ہمیشہ دیر سے کھاتا یا پھر کھاتا ہی نہ تھا۔ بستر پر لیٹ کر اُسے پہروں نیند نہ آتی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے اُس کا دماغ حساب کتاب میں اُلجھا رہتا۔

اُس کی بیوی، جو اُسے بے حد چاہتی تھی، سوچا کرتی کہ کام کے ساتھ آرام اور تفریح بھی کرنی چاہیے۔ وُہ کہتی:

”آپ کُچھ دیر کے لیے کام روک کیوں نہیں دیتے؟ کام کا کیا ہے، ہوتا ہی رہے گا۔“

چن پوشن جواب دیتا۔ ”بیگم، یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہُوئی جیسے کوئی کسی شیر پر سوار آدمی سے کہے کہ تُم اِس درندے کی کمر سے پل بھر کے لیے اُتر کیوں نہیں جاتے، اور وُہ جواب دے کہ اگر میں اُترا تو شیر مُجھے کھا جائے گا۔“

چن پوشن کے پڑوس میں ایک غریب آدمی رہتا تھا۔ چن پوشن جتنا امیر تھا، یہ آدمی اتنا ہی غریب۔ اُس آدمی کا نام تھا "لی“۔ لی بے چارہ مزدور تھا۔ جہاں محنت مزدوری ملتی، چلا جاتا۔ کھیتوں میں ہل چلانے کا کام مل جائے یا سڑکیں کُوٹنے کا، اُس کے لیے سب برابر تھے۔ مزدوری بُہت تھوڑی ملتی تھی۔ بس اِتنے پیسے مل جاتے جس سے وہ اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ مُشکل سے پالتا اور موٹا جھوٹا پہن کر گزارہ کرتا۔

لی تمام دِن جان کھپا کر پسینے پسینے ہو جاتا تھا۔ رات کو تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ آتے ہی پہلا کام یہ کرتا تھا کہ اپنی دِن بھر کی کمائی بیوی کی جھولی میں ڈال دیتا۔ اب اُسے کوئی فِکر نہیں ہوتی تھی۔ دال روٹی کھا کر خُدا کا شکر ادا کرنا۔

گرمیوں کے دنوں میں جب شام کا جھُٹ پُٹا ہولے ہولے پھیلتا، لی اپنی جھونپڑی

کے باہر بانسری لے کر بیٹھ جاتا اور سُریلے سُروں میں کوئی گیت چھیڑ دیتا۔ اُسے اپنی یہ زندگی بے حد پیاری تھی اور اُسے اپنی قسمت پر ناز تھا۔

گرمیوں کی خاموش شاموں میں اُس کی بانسری کی میٹھی لَے دُور دُور تک پھیل جاتی اور ہوا کی لہروں پر ڈولتی چِن پوشن کے کانوں تک پہنچتی۔ مگر چِن پوشن کو اُسے سُننے کی فُرصت کہاں تھی؟ ہاں بانسری کی دُھن چِن پوشن کی بیوی کو بے چین کر دیتی تھی۔ وہ دِل ہی دِل میں کہتی:

"کِتنی حیرت کی بات ہے کہ غریب لی غریبی کے باوجود اِس قدر خُوش ہے۔ اور میرا شوہر جو اِتنا دولت مند اور عقل مند ہے، سارا دِن کام دھندے میں پھنسا رہتا ہے۔ مُجھے کتنی خوشی ہو اگر میرا شوہر بھی اِسی طرح آرام سے بیٹھ کر بانسری پہ میٹھی راگنی چھیڑے۔"

ایک دن یہی بات اُس نے چِن پوشن سے بھی کہی۔ چِن پوشن نے حساب کتاب کا رجسٹر ایک طرف رکھا اور مُسکرا کر بولا: "داناؤں نے کہا ہے کہ غریبوں کے پاس وقت فالتُو ہوتا ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ لی شام کے وقت گا بجانا چھوڑ دے تو

کل ہی لو۔ میں اُس کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے، اس کے ساتھ ہو گی زیادتی۔ "

بیوی نے بے صبری سے پوچھا۔ "کیا کریں گے آپ؟ "

"میں اُس کو کُچھ روپے دے دوں گا۔ "

بیوی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ساری حویلی اُس کے قہقہے سے گُونج اُٹھی۔ کِتنی خُوشی کی بات تھی کہ آج اُس حویلی میں وہ کھُل کر ہنسی تھی! پھر اس نے شوہر سے کہا:

"لیکن لی روپیہ لے کر تو اور زیادہ خوش ہو گا۔ "

چِن نے جواب دیا۔ "دیکھیں گے۔ اگر تُم اُسے کُل شام بھی بانسری بجاتے سُنا تو میرا نام بدل دینا۔"

دُوسرے دن صُبح سویرے چِن نے لی کو بُلانے کے لیے نوکر بھیجا اور کہا کہ اُس سے کہنا، سیٹھ صاحب تُم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

بھلا لی سیٹھ صاحب کے حکم کو ٹال سکتا تھا۔ دوڑا دوڑا آیا۔ لی کو دیکھ چِن کُرسی سے اُٹھا اور بولا :

"آؤ بھائی لی، میرا بُہت جی چاہتا تھا کہ کبھی تُم سے مِلوں، مگر کیا کروں فُرصت ہی نہیں ملتی۔ بولو، کیسی گُزر رہی ہے ؟"

لی بے چارہ گھبراہٹ کے مارے کبھی ایک پیر کے بَل کھڑا ہوتا، کبھی دُوسرے کے۔ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا:

"جناب، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مُجھ جیسے مزدُور کی زندگی کیسی گُزرتی ہے۔ ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ کام بُہت سخت اور مزدُوری بُہت کم۔ لیکن اگر تکلیف کو تکلیف ہی سمجھتے رہیں تو زندگی عذاب بن جائے۔ آپ کو معلُوم ہی ہے کہ میری بیوی بڑی سُگھڑ اور سمجھ دار ہے۔ بُرا بھلا گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔"

چِن پوشن مُسکرایا اور پھر بولا۔ "ہاں بھائی لی، میں اکثر تُمھارے بارے میں سوچتا رہتا ہُوں۔ مُجھے معلُوم ہے کہ مزدُور اتنا نہیں کما سکتا جِتنا اُسے کمانا چاہیے۔ پھر اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا: "دیکھو، ہم ایک عرصے سے ایک دوسرے کے

ہمسائے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے درمیان کبھی کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہُوئی۔ میں چاہتا ہُوں کہ تُمھاری مدد کرُوں۔ لو، یہ پانچ سو روپے ہیں۔ ان سے کوئی کاروبار شروع کرو، تاکہ عیش و آرام سے گُزر بسر کر سکو۔"

لی بے چارہ اِحسان کے مارے زمین میں جھُک گیا۔ اُسے شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ بڑی مُشکل سے کمرے سے باہر نِکلا۔ بھاگتا ہوا گیا اور بیوی کو پانچ سو روپے کی خوش خبری سُنائی۔

اُس روز لی کام پر نہیں گیا۔ بیوی کے ساتھ صلاح مشورہ کرتا رہا کہ اُس روپے سے کون سا کاروبار کیا جائے۔ ایک نہیں بیسیوں سکیموں پر بحث ہُوئی، مگر وُہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ کوئی سکیم پسند نہ آئی۔

وُہ بحث کرنے میں اِتنے مگن تھے کہ کھانا وقت پر تیّار نہ ہو سکا۔ اُس کے باوجُود لی کو بھُوک نہ تھی۔ کھاتے ہُوئے اُسے یہ تک ہُوش نہ تھا کہ وُہ کیا کھا رہا ہے۔ اُس کا دماغ تو روپوں اور کاروبار میں اُلجھا ہوا تھا۔

اُدھر بڑی حویلی میں چِن پوشن کی بیوی کھڑکی کھولے بانسری کے سُریلے نغمے کا

اِنتظار کر رہی تھی۔ نغمہ تو کیا، اُسے ایک سُر بھی سُنائی نہ دیا اور نہ لی کے گانے ہی کی آواز آئی۔ وہ بھاگی بھاگی شوہر کے پاس گئی اور بولی :

"آپ ٹھیک کہتے تھے۔"

اُدھر لی جب سونے کے لیے لیٹا تو نیند اُس سے کوسوں دُور تھی۔ وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ صُبح اُٹھا تو آنکھیں بوجھل تھیں۔ سیدھا اُس جگہ جہاں رُوپے چھُپا کر رکھے تھے، گیا یہ تسلّی کرنے کی روپے وہاں موجود ہیں؟

اس کے بعد دو دن اور دو راتیں دونوں میاں بیوی روپے کو کاروبار میں لگانے کی فکر میں پریشان رہے۔ میرا خیال ہے کہ تیسری رات جب لی بستر پر لیٹا تو بے چین تھا۔ اُسی وقت خُوش قسمتی کا فرشتہ لی کے پاس آیا اور بولا :

"دولت وبالِ جان ہے۔ اگر تُم اِس بات کو سمجھ جاؤ تو تُمہاری پریشانی دُور ہو جائے گی۔" لی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اُس کا ذہن صاف ہو گیا اور وہ اِطمینان کی نیند سو گیا۔

دُوسرے دن صُبح سویرے لی چِن پوشن کے گھر پُہنچا۔ چِن نے چونک کر کہا:

"آؤ بھائی لی۔ کہو، کِسی کاروبار کا فیصلہ کیا؟" لی نے جھکتے ہوئے کہا۔ "ہاں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میں آپ کو چاندی کی پانچ سو روپلّیاں واپس کرنے آیا ہُوں۔ میں اِس مہربانی کے لیے آپ کا اِنتہائی شُکر گزار ہوں۔"

یہ کہا اور رُوپوں کی تھیلی چِن کے سامنے رکھ دی۔ پھر تیزی سے باہر نِکل کر کام پر چلا گیا۔

اُس روز لی نے بڑی محنت سے کام کیا۔ اُس شام، پہلے کی طرح، پھر اُس کی سُریلی بانسری فضا میں گونجی اور اُس کی محبت بھری آواز ہوا کے کندھوں پر باغ سے ہوتی ہوئی، بڑی حویلی میں پُہنچی۔ چِن پوشن کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے ایک نظر شوہر پر ڈالی۔ وُہ اب بھی اپنے رجسٹر پر جھکا حساب کتاب کر رہا تھا۔

پھر چِن نے سر جھکا کر بیوی کی طرف یُوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "ہاں سُن لیا۔" اُس کے ساتھ ہی پھِیکی سی مُسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل گئی۔

جھیل کنول

کِسی بُہت پُرانے شہر میں، جس کا اب نام نشان تک مٹ چُکا ہے، بڑے مندر کے سامنے ایک جھیل تھی۔ اس کا نام تھا جھیل کنول۔

مندر کی چھت اُوپر سے بل کھاتی ہُوئی نیچے تک چلی گئی تھی۔ اس کو نیلے چمک دار ٹائلوں سے سجایا گیا تھا۔ چھت کے نِچلے کناروں پر ہرے کانچ کے بنے ہُوئے شیر، بادشاہ اور اژدھے جھالر کی طرح لٹک رہے تھے۔ یہ نیلے رنگ کی ٹائلیں اور ہرے کانچ کے بُت جب اپنا عکس جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ڈالتے تو سُرخ رنگ کے کنول کے پھُولوں کے ساتھ مِل کر اِتنے اچھّے لگتے کہ بس یہی جی چاہتا کہ عُمر بھر دیکھتے ہی رہو۔

لوگ دُور دُور سے جھیل کنول کو دیکھنے آتے تھے اور لہو جیسے کنول کے پھُولوں کو دیکھ کر لُطف اُٹھاتے تھے۔ جھِیل کے ان پھُولوں میں ایک پھُول تو دیکھنے سے تعلّق رکھتا تھا۔

یہ پھُول بُہت بڑا اور باقی پھُولوں سے کہیں زیادہ سُرخ تھا۔ یہ پانی کی سطح سے اُونچا تھا جب کہ باقی پھُول پانی کے بالکل ساتھ لگے ہوئے تھے۔ اِس کے علاوہ یہ سارا دِن جھیل کی سطح پر سر اُٹھائے رکھتا۔ پھر جُوں ہی شام ہوتی، پانی میں ڈوب جاتا، اور اُگلی صُبح پھر نِکل آتا۔ لوگ اس پھُول میں چیزیں رکھ دیتے اور اُنہیں پھُول کے ساتھ جھیل میں ہولے ہولے ڈوبتا دیکھ کر بُہت خُوش ہوتے۔

لوگوں نے جلد ہی اِس عجیب و غریب لال پھُول کے متعلّق طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ مندر کے ایک پُجاری نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ لال پھُول اصل میں تین صدیوں تک مہاتما بُدھ کا تخت رہا ہے۔ یہ سُننا تھا کہ لوگوں نے اسے جنّت کی سیڑھی سمجھ لیا اور کہنے لگے کہ جو خُوش قسمت اِس تخت پر بیٹھے گا، سیدھا جنّت میں جائے گا۔

چینی اپنے بزُرگوں کی بہت عزّت کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں بُوڑھے لوگ خُود فیصلہ کرتے تھے کہ اُنہیں کب یہ دُنیا چھوڑ کر جنّت میں جانا چاہیے۔

جُوں ہی جھیل کنول کے لال پھُول کی خبر شہر میں پھیلی، بُوڑھے لوگ اُس کے ذریعے جنّت میں جانے لگے۔ یہ طریقہ بُہت آسان تھا۔ اس میں وقت بھی کم لگتا تھا۔ بزُرگ مرد یا عورت کو آرام سے لال پھُول پر رکھ دیا جاتا۔ شام کے وقت پھُول کے پانی کے اندر جاتے ہی وہ شخص بھی پانی میں ڈوب جاتا۔

سال پر سال گُزرتے گئے۔ کتنے بزُرگ کنول کے اِس تخت پر بیٹھ کر اِس دُنیا سے سدھارے ہوں گے؟ یہ کِسی کو معلُوم نہیں۔

شہر کے گورنر کی والدِہ اب کافی بُوڑھی ہو چُکی تھی۔ اُس کے دِل میں بھی خیال آیا کہ اب اس دُنیا کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اس نے اپنے بیٹے کو بُلا بھیجا۔ وُہ اُس کے پاس آیا۔ جھُک کر آداب بجالایا اور پُوچھا:

"کہیے، کیسے یاد فرمایا؟"

ماں نے دھیرے سے کہا۔ ”بیٹا، خُدا نے مُجھے بہت عزّت دی۔ میں ایک بڑے افسر کی ماں ہُوئی۔ لیکن میں بھی باقی عورتوں کی طرح ایک عورت ہی ہوں۔ یہاں کی عورتیں جب میری عُمر کو پہنچتی ہیں تو کنول کے تخت پر بیٹھ کر بہشت میں چلی جاتی ہیں۔ میری بھی یہی تمنّا ہے کہ میں بھی اِسی راستے سے جنّت میں جاؤں۔ اس لیے میرے سفر کی تیّاری کرو۔ مُجھے اب اِس دُنیا میں رہنے کی حسرت نہیں۔ “

گورنر کو یہ سُن کر بے حد صدمہ ہوا۔ اُسے جھیل کنول کے بارے میں زیادہ عِلم نہیں تھا۔ اُس نے پُوچھ گُچھ کی، اور جب اُسے لوگوں کے عقیدے کے متعلّق بتایا گیا تو اُسے فکر ہوئی۔

وہ فوراً اپنی ماں کے پاس پُہنچا اور بولا۔ ”ماں جی، آپ اِن جھُوٹی کہانیوں پر یقین نہ کریں۔ آپ زندہ رہیں اور مُجھے اپنی خدمت اور نیک دُعاؤں کا موقع دیں۔ میں آپ کو ہرگز مرنے نہیں دُوں گا۔ “

اس پر ماں کو سخت غصّہ آیا۔ چیخ کر بولی۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تُم کیسی

گورنری کرتے ہو گے۔ تُمھیں تو ماں کی اِطاعت کرنی نہیں آتی۔ تُمھارے ایمان کو کیا ہوا؟ اچھّے بیٹے تو اپنے ماں باپ کو جنّت میں پُہنچا کر خُوش ہوتے ہیں۔ تُمھیں کوئی حق نہیں کہ مُجھے جنّت میں جانے سے روکو۔" بیٹے نے سر جھُکا کر کہا۔"ماں جی، مُجھے معاف کیجیے۔ جو آپ کہیں گی وہی ہو گا۔ میں ابھی جا کر آپ کے سفر کی تیّاری کرتا ہوں۔ آپ کے پاس کھانے کی چیزیں اور کُچھ کپڑے بھی تو ہونے چاہئیں۔ "

ماں نے کہا۔ "نہیں بیٹا، جنّت میں یہ چیزیں لے جانے کی کیا تُک ہے؟ وہاں پر سب کُچھ ہو گا۔ بس بیٹا، میرے لیے ڈولی تیّار کر دو، جو کل صُبح مُجھے جھیل کنول تک پُہنچا دے۔ "

بیٹا ماں کو سلام کر کے چلا تو گیا مگر سخت پریشان تھا۔ اُسے لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ آخر اُس نے خوب غور کرنے کے بعد ایک ترکیب سوچی۔

اُس نے اپنے مُلازم کو بُلایا اور حُکم دیا کہ نوکروں سے بوریوں میں بارُود اور چُونا بھرنے کے لیے کہو۔

”جناب، کِتنی بوریاں؟ “

”بُہت سی۔ ہمارے پاس جِتنا بارُود اور چُونا ہے، سب بھر دو۔ “

جب بُوریاں بھر کر تیّار ہو گئیں تو اُنہیں ایک کشتی میں رکھ دیا گیا اور اُسی شام کشتی کھے کر جھیل میں اُس مقام پر لے جائی گئی جہاں کنول کا سُرخ پھُول پانی کی سطح پر سر اُٹھائے کھڑا تھا۔

گورنر نے کشتی کے سِرے پر کھڑے ہو کر حکم دیا کہ بارُود کی بوری پھُول پر رکھ دی جائے۔ نوکروں نے ایسا ہی کیا۔ بوری غائب ہو گئی۔ پھِر چُونے کی بوری ڈال دی گئی۔ پھُول نے وُہ بھی نِگل لی۔ یہ سلسلہ کب تک جاری رہا؟ یہ بتانا مُشکل ہے، اور یہ بتانا اور زیادہ مُشکل ہے کہ کِتنی بوریاں پھُول میں ڈالی گئیں۔

وہ ڈالتے گئے، ڈالتے گئے، یہاں تک کہ آخری بوری بھی پھُول میں چلی گئی۔ جب شام ہُوئی تو کنول کا پھُول خاموشی سے پانی میں ڈوب گیا۔

گورنر کنارے پر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس نے بارُود اور چُونے کی بھری ہوئی

کشتی جنّت میں اُتار دی ہے۔ یہ تھی تو بہادری کی بات، مگر وہ کُچھ کانپ رہا تھا۔

دوسرے روز صُبح سویرے گورنر اپنے بیٹے، بیٹوں اور رشتے داروں سمیت ماں کے پاس پُہنچا تاکہ وہ اس کو بہشت تک الوداع کہنے چلیں۔ جب یہ لوگ ماں کو لے کر جھیل کے پاس پہنچے تو آگے جانا مُشکل ہو گیا، کیوں کہ لوگوں کی بھِیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگوں نے گورنر کو بتایا کہ جھیل میں ایک بہت بڑا سانپ مرا پڑا ہے۔

جب گورنر کنارے پر پُہنچا تو اُس نے دیکھا کہ جھیل میں سچ مُچ ایک بُہت بڑا سانپ پڑا ہے۔ اُس کا سر پانی کے اُوپر تھا اور دھڑ مُڑا تُڑا پانی کے اندر پڑا تھا۔

گورنر نے آدمیوں کو حکم دیا کہ اس خُوف ناک سانپ کا پیٹ چیرو۔ سانپ اِتنا بڑا تھا کہ تین دِن لگ گئے، جب کہیں جا کر اُس کا پیٹ چاک ہُوا۔

اب پتا چلا کہ یہ خُون کی طرح لال کنول اصل میں پھُول نہیں، سانپ کی زبان تھی۔ جب کوئی بُوڑھا اُس پر بیٹھتا تھا تو سانپ اُسے نِگل لیتا تھا۔ سانپ کے پیٹ میں سے بُوڑھوں کی ڈھیر ساری ہڈّیاں نکلیں۔

یہ سب بُوڑھے بے چارے سانپ کا نوالہ بن چُکے تھے، سوائے بارُود اور چُونے کے جو ابھی تک دُھواں دے رہا تھا۔

دو بے وقوف

کِسی گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اُس کا نام تھا لین۔ لین کو ایک روز گِرے پڑے دس روپے مل گئے۔ اُس نے آج تک دس کا نوٹ نہیں دیکھا تھا۔ نوٹ پا کر وُہ پہلے تو بُہت خُوش ہُوا، پھر یہ خیال ستانے لگا کہ اِس خزانے کو رکھوں گا کہاں؟ کِسی ایسی جگہ چھُپانا چاہیے جہاں کِسی کی نظر نہ پڑے۔ نہیں تو کوئی چُرا لے گا۔

سوچ سوچ کر لین کا بُرا حال ہو گیا۔ جھونپڑی میں کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی۔ آخر اُسے ایک ترکیب سُوجھی۔ کیوں نہ جھونپڑی کی دیوار میں سوراخ کر کے اُس میں نوٹ رکھ کر، اُوپر سے لیپ کر دیا جائے؟ ترکیب اچھّی تھی۔ اُسے پسند آئی۔

اُس نے جھونپڑی کا دروازہ بند کر لیا اور دیوار کو گھُورنے لگا۔ خُوشی اور خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ کئی بار کام بند کر کے باہر جھانکا۔ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا؟ کوئی سُن تو نہیں رہا کہ لین روپیہ چھُپا رہا ہے؟

جب کچّی دیوار میں سُوراخ ہو گیا تو لین نے اُس میں دس کا نوٹ ٹھونس کر اُوپر سے کیچڑ کا لیپ کر دیا۔

اس کے بعد وُہ جھونپڑی کے باہر بیٹھ کر پہرا دینے لگا تا کہ کوئی اندر نہ جائے۔ وہ سوچ رہا تھا، جو کوئی بھی اندر آئے گا، مُجھ سے پُوچھے گا۔

"لین، یہ دیوار گیلی گیلی کیوں ہے؟ ضرُور دال میں کُچھ کالا ہے۔ کوئی شے چھُپا رکھّی ہے تُم نے؟"

اور پھر وُہ رُوپے چُرا لے گا۔ اس ڈر سے لین جھُونپڑی کے باہر اُس وقت تک بیٹھا رہا جب تک دیوار پر گیلی گیلی کیچڑ سُوکھ نہیں گئی۔

اِتنا کُچھ کر لینے کے بعد بھی اُس کی تسلّی نہیں ہوئی۔ اب اُسے ایک اور وہم ستانے

لگا۔ فرض کرو چور اُس کے دس روپے چُرانے کے لیے اندر آجاتے ہیں۔ وہ کہاں ڈھونڈیں گے؟ آخر وُہ کہاں ڈھونڈیں گے؟ دِیواروں کے سِوا اور کون سی جگہ ہو سکتی ہے جہاں وہ تلاش کریں گے۔ سیدھی سی بات ہے کہ چور دیوار کھودیں گے۔ یہ خیال آتے ہی لین کے پسینے چھُوٹ گئے۔ اب کرے تو کیا کرے؟ بہُت سوچا۔ دماغ مارا۔

اب جو ترکیب ذہن میں آئی تو وہ خُوشی سے اُچھل پڑا۔ بھاگا بھاگا پڑوسی کے گھر گیا، رنگ اور برش مانگ لایا اور بڑی اِحتیاط سے عین اُس جگہ جہاں رُوپے دبائے تھے، بڑے بڑے حرُوف میں لکھ دیا:

"یہاں کوئی خزانہ نہیں ہے۔"

اِسی گاؤں میں ایک اور احمق رہتا تھا۔ اُس کا نام تھا وان۔ وان ایک روز لین سے ملنے آیا۔ لین کو موجُود نہ پا کر وان نے جھونپڑی میں جھانکا۔ لین کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہُوئے وان کی نظر دیوار پر پڑی۔ لِکھا تھا:

"یہاں کوئی خزانہ نہیں ہے۔"

وان حیران پریشان سوچنے لگا۔ ”بھلا لین نے یہ بے وقوفی کی بات کیوں لکھّی؟ اُس کے پاس دولت کہاں سے آئی جو دیوار میں چھُپائے؟ مگر نہیں۔ اُس نے یہ لکھا کیوں؟ ضرُور کوئی بات ہے۔“ یہ خیال آتے ہی اُس نے دیوار کھود کر روپے نکال لیے۔

دس رُوپے پا کر وان کی خُوشی کی اِنتہا نہ رہی۔ وُہ اُنھیں خرچ کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا کہ دِل کا چور اُسے ڈرانے لگا:

”فرض کرو کِسی کو پتا چل گیا کہ رُوپے میں نے چُرائے ہیں تو کیا ہو گا؟ تھانے دار مُجھے گھسیٹ کر لے جائے گا اور وہ پٹائی کرے گا کہ نانی یاد آ جائے گی۔ اور پھِر، پھِر مُجھے سچ بولنا پڑے گا۔ اور پھِر؟“

فکر کے مارے وان کا دِل دھڑکنے لگا۔ اپنے گھر جا کر بھی اُسے چین نہ آیا۔ اچانک اُسے ایک ترکیب سُوجھی، اور اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

وُہ دوڑا دوڑا گیا۔ لین کی طرح بُرش اور رنگ مانگ لایا اور اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بڑے سے حرُوف میں لکھ دیا:

”میں ایک ایمان دار آدمی ہُوں۔ میں نے لین کی دیوار میں سے روپیہ نہیں نکالا۔“

نیک دل لالچی

بُہت پرانے زمانے کی بات ہے، چین کے شہر چنگٹو میں، ایک نیک دِل امیر آدمی رہتا تھا۔ وُہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتا۔ اس کے بدلے میں کوئی اُس کا شکریہ ادا کرے یا نہ کرے، اُسے اِس کی پروانہ تھی۔ اُس سخاوت کی وجہ سے وُہ دُور دُور مشہور ہو گیا تھا۔ لوگ اُس کی نیکی کا چرچا کرتے تھے۔ ہوتے ہوتے اُس کی شُہرت آسمانی دیوتاؤں تک جا پُہنچی۔

ایک دن دو دیوتاؤں نے فیصلہ کیا کہ وہ اِنسانوں کے بھیس میں اُس نیک دِل آدمی کے گھر جائیں گے۔ اُن میں سے ایک دیوتا کا نام ''لِنگ مُو'' اور دُوسرے کا ''چنگ کُو'' تھا۔ لِنگ مُو بیسا کھیوں کے سہارے اور چنگ کُو سفید خچّر پر سوار ہو

کر امیر آدمی کے گاؤں پُہنچے۔

محل میں داخل ہونے سے پہلے دونوں دیوتاؤں نے بدن پر چیتھڑے لپیٹ لیے اور بھکاری بن گئے۔ ِکنگ مُوتو بیساکھیوں پر چلتا رہا مگر چنگ کُو بُہت ہوشیار تھا۔ اُس نے خچّر پر منتر پھُونکا۔ خچّر کاغذ کا ایک ٹکڑا بن گیا۔ پھر اُس نے کاغذ کا یہ ٹکڑا تہہ کیا اور اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔

اب یہ دونوں بھکاری محل کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ ِکنگ مُو نے چنگ کُو کے دو تین بیساکھیاں جڑ دیں۔ چنگ کُو کو غصّہ آیا تو اُس نے ِکنگ مُو کی داڑھی نوچ لی۔ اب کیا تھا۔ بات بڑھ گئی۔ مار پیٹ، دھینگا مُشتی شرُوع ہو گئی۔

دروازے پر دونوں نے خُوب غُل غپاڑا مچایا۔ امیر آدمی نے اپنے مُلازموں کو حکم دیا کہ وُہ معلُوم کر کے آئیں کہ اُس کے گھر کے سامنے کون اُودھم مچا رہا ہے۔

"جناب، دو بُڈّھے بھکاری ہیں۔" مُلازموں نے آ کر بتایا۔ اس پر امیر آدمی خُود چل کر باہر آیا اور دونوں بھکاریوں کو اندر آنے کی دعوت دی۔ دونوں بھکاری

فوراً راضی ہو گئے اور لڑنا بھڑنا بند کر دیا۔ امیر آدمی نے بھکاریوں کو محل کے اندر لے جا کر شان دار پوشاکیں اور خُوب صُورت جُوتے پہنائے۔ پھر اُن کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھایا۔ وُہ کھانا کھانے بیٹھے تو یوں لگتا تھا جیسے اُنہوں نے عُمر بھر کبھی کھانا نہیں دیکھا۔ ندیدوں کی طرح ٹُوٹ پڑے۔ نوکر مزے دار کھانوں کی بھری ہوئی قابیں لا کر سامنے رکھتے تو دونوں میں سے کوئی بھی اپنے میزبان کے اِشارے کا انتظار نہ کرتا۔۔ یہاں تک کہ امیر آدمی خُود بھُوکا رہ گیا اور تمام کھانا بھکاری چٹ کر گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر دونوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ رات ہو رہی تھی اور اب اُنہیں محل سے رُخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ اُن کا اِرادہ یہیں رات بسر کرنے کا تھا۔

امیر آدمی نے سوچا کہ بے کار بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کُچھ بات چیت کی جائے۔ سو اُس نے بھکاریوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ بھکاری پہلے تو چُپ رہے، پھر اُوٹ پٹانگ بکنے لگے۔ کوئی اور ہوتا تو اُن کی ڈنڈوں سے مرمّت کرواتا

مگر ہماری کہانی کا ہیرو بُہت ہی نیک دِل تھا۔ وُہ صبر کرتا رہا۔

پھر بھکاریوں میں سے ایک بولا۔ "ہم آج رات یہیں رہیں گے۔"

امیر آدمی اس پر بھی رضا مند ہو گیا۔ اُن کے لیے صاف سُتھرے نرم گرم بستر لگا دیے گئے اور وہ گندے ہاتھ پیر لیے اُن میں گھُس گئے۔ اپنے چیتھڑے بھی بستروں پر ڈال لیے اور کہا کہ ہمیں بُہت سردی لگتی ہے۔ غرض اُنہوں نے بستروں اور کپڑوں کا ناس کر کے رکھ دیا۔

دونوں بھکاری رات بھر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتے اور اُدھم مچاتے رہے۔ نہ سوئے، نہ سونے دیا۔ لیکن کیا مجال جو نیک دِل امیر آدمی کے ماتھے پر ذرا بھی بل پڑا ہو۔

صُبح ہوئی تو امیر آدمی نے بھکاریوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر ناشتا کروایا۔ پھِر اُنہیں رُخصت کرنے دُور تک گیا، جیسے کہ وہ بُہت ہی عزّت والے مہمان تھے۔

اگلے روز صُبح کے وقت امیر آدمی باغ میں ٹہل رہا تھا۔ اُس کی مُلازِمہ کُنویں سے پانی بھر کر لا رہی تھی۔ امیر آدمی نے حسرت سے کہا:

”اس کنویں میں پانی کے بجائے شربت ہوتا تو کتنا اچھّا ہوتا!“

نوکرانی نے مُسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔ پھر خُوشی کے مارے اُس کی چیخ نِکل گئی۔ کیوں کہ بالٹی میں پانی کی جگہ شربت بھرا ہوا تھا۔ نوکرانی نے وہ شربت گھڑے میں ڈالا اور دوبارہ بالٹی کُنویں میں ڈال کر باہر نِکالی تو اُس میں بھی شرت بھرا ہُوا تھا۔ امیر آدمی کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔ اس کے کُنویں کا پانی شربت بن گیا تھا۔

اب کیا تھا، امیر آدمی شربت بیچ بیچ کر اور زیادہ امیر ہو گیا۔

ایک دن یُوں ہُوا کہ ایک گاہک نے شربت کے بجائے انگُوروں کا رس مانگا۔ امیر آدمی کے پاس تو فقط شربت ہی تھا، انگُور کا رس کہاں سے لاتا! وُہ بڑی عاجزی سے بولا :

”انگُور کا رس تو ہمارے پاس نہیں ہے۔“

گاہک نے حقارت سے اُسے دیکھا اور پیر پٹختا ہُوا چلا گیا۔ امیر آدمی کو بُہت رنج

ہُوا۔ اگلی صُبح وُہ باغ میں چہل قدمی کرنے نِکلا تو وہی مُلازمہ شربت سے بھری بالٹی لیے پاس سے گُزری۔ امیر نے دِل ہی دِل میں کہا :

”کاش بالٹی میں شربت کے بجائے انگُوروں کا رس ہوتا۔ “

یہ خواہش کرنے کی دیر تھی کہ بالٹی اور کُنویں کا تمام شربت انگُوروں کے رس میں تبدیل ہو گیا۔ امیر آدمی رس بیچ بیچ کر پہلے سے بھی زیادہ امیر ہو گیا۔

زیادہ دِن نہیں گزرے تھے کہ ایک گاہک آیا اور بولا:

”میاں، آپ کے پاس انگُور کا چھلکا ہے ؟ “

امیر آدمی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ ”مُجھے افسوس ہے کہ میرے پاس انگُور کا چھلکا نہیں ہے۔ “

گاہک نے اُس کی ہنسی اُڑاتے ہوئے کہا :

”واہ بھئی، وا! انگُور کا رس بیچتے ہو اور انگُور کا چھلکا نہیں۔ تم سا احمق میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ “

امیر آدمی یہ سُن کے اُداس ہو گیا۔ اُسے رات بھر نیند نہیں آئی۔ اگلے روز صُبح سویرے باغ کی سیر کرنے نکل گیا۔

اُس آدمی کی بات اُس کے دِل میں کانٹے کی طرح چُبھ رہی تھی۔ اُس نے سوچا :

"میں کِتنا بد نصیب ہوں کہ میرے پاس انگُوروں کے چھلکے نہیں۔ کاش! میں اپنے گاہک کو انگور کا چھلکا دے سکتا۔"

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی دونوں گندے بھکاری تیز تیز چلتے ہُوئے اُس کے پاس آکھڑے ہُوئے۔ بیساکھی والے نے اُس سے کہا :

"تُم رحم دل آدمی ہو۔ اس میں شک نہیں۔ تُم بُہت سخی ہو، یہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر تم لالچی بھی بُہت ہو۔ جب تُمہارے کُنویں کے پانی کو شربت بنا دیا گیا تو تُم نے انگُور کا رس مانگا اور جب رَس مل گیا تو اب انگُور کے چھلکے جیسی ناکارہ چیز کی خواہش کرتے ہو۔ جاؤ، اب تُمہیں کُچھ نہیں ملے گا۔" یہ کہہ کر وُہ اور اُس کا ساتھی دونُوں غائب ہو گئے۔

اب امیر آدمی کے سامنے بھکاریوں کی جگہ آسمانی دیوتا ِکنگ مُو اور چنگ کُو کھڑے تھے۔ چنگ کُو نے امیر آدمی پر رحم بھری نظر ڈالی اور پھر وہ دونوں دروازے کی طرف بڑھے۔ باہر جا کر چنگ کُو نے بٹوے میں سے کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ منتر پھُونکا۔ اب اُس کے سامنے خچّر کھڑا تھا۔ چنگ کُو خچّر پر اور ِکنگ مُو بیساکھیوں پر سوار ہو کر تیز تیز دوڑنے لگے، اور پھر دوڑتے دوڑتے بادلوں میں جا چھُپے۔

امیر آدمی حیران، پریشان، خاموشی سے اُنہیں بات جاتا دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے

ڈرتے ڈرتے کُنویں میں جھانکا۔

کُنویں میں صاف شفّاف پانی کے سوا کُچھ نہ تھا۔

پریوں کا غار

کِسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ ایک دن وہ بالٹیاں لے کر میٹھے پانی کے چشمے پر پانی لینے گئے۔ یہ چشمہ کافی فاصلے پر تھا۔ جُوں تُوں کر کے وہ چشمے پر پُہنچ گئے اور اپنی اپنی بالٹی میں پانی بھی بھر لیا۔ اب جو اِدھر اُدھر نِگاہ دوڑائی تو معلُوم ہُوا کہ وہ تو جنّت میں کھڑے ہیں۔

یہاں موسمِ بہار تھا۔ اُن کے آس پاس جابجا جنگلی پھُولوں کے تختے تھے۔ نیلی کلغی والی سُرخ چِڑیاں ایک دُوسرے کے پیچھے اُڑتی ہُوئی گا رہی تھیں۔

”چِڑ چُوں چِڑ چُوں۔“

رنگ برنگی تتلیاں پھولوں کو پنکھے جھلتی پھر رہی تھیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز اِتنی

خُوب صورت اور دِل فریب تھی کہ دونوں بھائی سیر کرتے کرتے دُور نِکل گئے۔ چلتے گئے، چلتے گئے۔ رستے میں جنگل آئے، پہاڑ آئے، وادیاں اور میدان آئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک غار کے پاس جا پہنچے۔

اس غار کے پاس دو پریاں پتّھروں پر بیٹھی شطرنج کھیل رہی تھیں۔ دونوں بھائی چُپ چاپ کھڑے ہو کر پریوں کو کھیلتے ہوئے دیکھنے لگے۔ ان پریوں کے سامنے ایک سفید خرگوش اُچھل کُود کر رہا تھا اور ایک پَل کے لیے بھی نہیں رُکتا تھا۔ لڑکے اُس کو دیکھ کر بے حد حیران ہُوئے۔ جب سفید خرگوش اُچھلتا تو سبزے میں پھُول کِھل جاتے اور جب وہ نیچے بیٹھتا تو پھُول مُرجھا جاتے۔

پریاں شطرنج کھیل چُکیں تو اُنھوں نے اُن لڑکیوں کو دیکھا۔ ایک پری نے رُعب سے پُوچھا:

”ہا! تم یہاں کب سے کھڑے ہو؟“ لڑکوں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا:

”ہم دو گھنٹے سے آپ کو کھیلتے ہُوئے دیکھ رہے ہیں۔“ اس پر دونوں پریاں ناراض ہو گئیں۔

یہ دیکھ کر بڑے بھائی نے کہا۔ ”اچھّی پریو، آپ ناراض نہ ہوں۔ ہم جاتے ہیں۔“

پریوں نے کہا۔ ”اب مت جاؤ۔ تُمہارے گاؤں والے تُمہیں نہیں پہنچانیں گے۔“ لیکن لڑکوں نے کہا کہ ہم تو ضرُور جائیں گے۔ پریاں کُچھ پریشان سی ہو گئیں کیوں کہ وُہ لڑکوں کو مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔ اُنہوں نے دونوں بھائیوں کو گھاس کی ایک ایک پتّی دیتے ہُوئے کہا:

”اگر تمہیں گھر کے لوگ نہ پہچانیں تو واپس آ جانا اور جب تم یہاں پُہنچو گے تو اِس گھاس کی پتّی سے غار کی طرف اِشارہ کرنا۔ غار کا دروازہ کھُل جائے گا۔“

یہ کہہ کر اُنہوں نے شطرنج سمیٹی اور اُداس دِل سے غار کے اندر چلی گئیں۔ غار کا دروازہ اپنے آپ اِس طرح بند ہُوا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔

ڈر کے مارے دونوں بھائی بے تحاشا دوڑے۔ میٹھے چشمے تک پُہنچے تو دیکھا کہ وہاں کی ہر شے بدل چکی ہے۔ چشمہ تو تھا، مگر چاروں طرف پھیلے ہُوئے پھُولوں کی جگہ بڑے بڑے درختوں نے لے لی تھی۔

لڑکوں کو بڑا اچنبھا ہُوا۔ اب وُہ اپنے گھر کی طرف چلے۔ دیکھا کہ وہاں گاؤں ہے نہ گھر۔ مٹّی کے بس اُونچے اُونچے ڈھیر ہیں، ایک ٹُوٹی جھونپڑی کے سامنے دو بُڈّھے بیٹھے تھے۔ لڑکوں نے ادب سے جھُک کر اُن بُوڑھوں کو سلام کیا اور کہا:

"بڑے میاں، یہاں ہمارا گھر تھا۔ "

"کس کا گھر؟" ایک بُوڑھے نے پُوچھا۔

"بڑے میاں، میرا نام لیو آن چاؤ ہے اور یہ میرا چھوٹا بھائی یو آن چاؤ ہے۔ ہم اِسی گاؤں لنگچاؤ میں رہتے تھے۔ مگر اب ہمارا گھر نہ معلُوم کہاں غائب ہو گیا ہے!"

دُوسرا بُوڑھا زور سے ہنسا اور بولا :

"لیو آن چاؤ اور یو آن چاؤ۔ بدمعاشو تُم ہم بُوڑھوں کا مذاق اُڑانے آئے ہو؟ لیو چو اور یو آن ہمارے بزُرگوں میں سے تھے۔ اُنہیں مرے ہوئے کئی سو سال ہو گئے ہیں۔ ہم اُنہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ "

دونوں بھائی پریشان ہو گئے۔

اصل میں پریوں کے غار کے سامنے جو سفید خرگوش اُچھلتا اور بیٹھتا تھا، وہ موسم پری تھی۔ اُس کی ہر چھلانگ پر موسم بدلتا تھا۔ بہار، گرمی، خزاں اور جاڑا۔ دونوں بھائی غار کے سامنے دو گھنٹے نہیں، پورے چار سو سال کھڑے پریوں کا کھیل دیکھتے رہے تھے۔

لیکن لڑکوں کو اِس بات کا بالکل عِلم نہ تھا۔ وہ بُوڑھوں سے کہہ رہے تھے کہ یہاں اُن کا گھر تھا۔ بُوڑھوں نے غصّے میں آکر شور مچانا شروع کر دیا اور اِرد گرد کے لوگوں کو اکٹھّا کر لیا۔

لوگوں نے جب دیکھا کہ دو چھوکرے بے چارے بُوڑھوں کو تنگ کر رہے ہیں تو اُنھوں نے لیوچو اور یو آن کی خُوب پٹائی کی اور اُنہیں وہاں سے بھگا دیا۔

اب لڑکوں کو یاد آیا کہ پریوں نے جو کُچھ کہا تھا، وہ سچ تھا۔ بس اب وُہ پریوں کے دیس میں جا کر رہیں گے۔ وہ چلتے گئے، چلتے گئے، یہاں تک کہ پریوں کے غار کے سامنے جا پہنچے۔ لیکن اندر کیسے جاتے، گھاس کی پتّیاں، جو پریوں نے غار کا دروازہ کھولنے کے لیے دی تھیں کہیں گِر گئی تھیں۔ جب تک وہ گھاس کی پتّی سے

دروازے کی طرف اِشارہ نہ کرتے، وہ نہیں کھُل سکتا تھا۔ اب کیا کریں؟ وہ دروازہ کھٹ کھٹانے لگے۔

یوں ہی کھٹکھٹاتے کھٹکھٹاتے دونوں بھائی بھُوکے پیاسے مر گئے۔ پریوں کے غار کا پتھّر نہ ہٹا۔
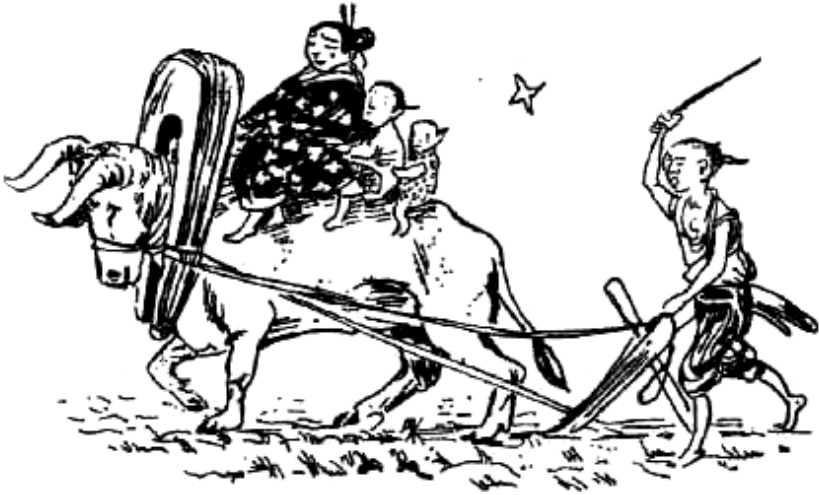
عقل مند جرنیل

اِس کہانی میں پریاں ہیں نہ جادُو۔ پھر بھی اِس میں پریوں اور جادُو والی کہانیوں جیسی دِل چسپی ہے۔ یہ کوئی دو ہزار سال پہلے کی کہانی ہے۔

اُس زمانے میں چین پر پادشاہ شاؤ حکُومت کرتا تھا۔ اُس کی سلطنت پر کِسی طاقت ور دُشمن نے چڑھائی کر دی۔ شاؤ کے جرنیل "ما" نے جلدی جلدی فوج تیّار کی اور دُشمنوں کے مُقابلے کے لیے نکل کھڑا ہُوا۔

بد قسمتی سے جرنیل، اپنی فوج سمیت پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹک گیا اور دُشمن کی فوج کے جرنیل ذوما نے اُس کو گھیرے میں لے لیا۔ جنرل ما نے فیصلہ کیا کہ وُہ

اپنی فوج کے ساتھ ایک بار دُشمن پر پل پڑے اور اُس کے گھیرے کو توڑ دے۔ لیکن حملہ ناکام ہُوا۔ جنرل مامیدانِ جنگ میں کام آیا اور اُس کی فوج تتّر بتّر ہو گئی۔ دُشمن فوج کا جرنیل ذوما اپنی فوج لے کر شاؤ کے دارالحکُومت چیہ تنگ کو فتح کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ چیہ تنگ میں ایک بُوڑھا جرنیل بھی رہتا تھا، جس کا نام چوکیلیانگ تھا۔ اُس کے پاس فوج نہیں تھی کیوں کہ وُہ فوج کی نوکری چھوڑ چُکا تھا۔

ایک دِن چیہ تنگ شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ بُہت دُور، مٹیالی سڑک پر ایک فوج آرہی ہے۔ اُس کے ہتھیار تیز دھوپ میں چمک رہے تھے۔ یہ جرنیل ذوما کی فوج تھی۔

دُشمن فوج آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ فوجی دستوں کے کپتان رنگ برنگ کلغیوں والی ٹوپیاں پہنے، گھوڑوں پر سوار کبھی بھاگ کر پیچھے چلے جاتے، کبھی آگے آجاتے۔

کُچھ دیر بعد فوج کا سب سے اگلا دستہ شہر کے دروازے سے صاف دِکھائی دینے

لگا۔ لیکن اچانک دستے کے کپتان نے کڑک کر کوئی حکم دیا اور سپاہی چلتے چلتے رُک گئے۔ کپتان تیزی سے گھوڑا دوڑاتا پچھلی صفوں میں جرنیل ذوما کے پاس پُہنچا۔

جرنیل ذوما اور دُوسرے بڑے افسر گھوڑے دوڑاتے ہُوئے سب سے اگلے دستے کے پاس آ گئے اور شہر کے بڑے دروازے کو کھُلا دیکھ کر حیرت میں ڈُوب گئے۔

شہر کے دروازے پر صرف چار بُڈھے سپاہی اُس سڑک پر جھاڑُو دے رہے تھے جِس پر سے جرنیل ذوما کو گُزر کر اندر داخل ہونا تھا۔ یُوں لگتا تھا کہ جرنیل ذوما کے اِستقبال کی تیّاریاں ہو رہی ہیں۔ شہر کے دروازے کے اُوپر بُوڑھا جرنیل چیوکیلیانگ بیٹھا سِتار پر کوئی دُھن بجا رہا تھا۔

جرنل ذوما زور سے للکارا :

”جرنیل، تُم بہُت چالاک ہو۔ لیکن میں بھی ایسا سیدھا نہیں کہ تُمہارے چکّر میں آ جاؤں۔“

پھِر اُس نے اپنے افسروں سے کہا۔ "ہو نہ ہو جرنیل نے شہر کی دیواروں کے پیچھے کو یہ بہُت بڑی فوج چھُپا رکھی ہے۔ تب ہی اِتنے اِطمینان سے بیٹھا ہے۔" اُس نے یہ کہا اور فوج کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ دروازے کے اُوپر بیٹھا جرنیل چیو کیلیانگ دُشمن کی فوج کو آہستہ آہستہ واپس جاتے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ نظروں سے اُوجھل ہو گئی۔

تب بُوڑھا جرنیل چو کیلیانگ مُسکرایا اور چاروں بُوڑھے سپاہی جو اپنی جھاڑوؤں کا سہارا لیے چُپ چاپ کھڑے تھے، زور زور سے ہنسنے لگے۔